ٹیپو سُلطان
پروفیسر عبدالمغنی
مکتبہ اسلامی مرکزی دہلی

ٹیپو سلطان

ڈاکٹر عبد المغنی

مرکزی مکتبہ اسلامی، دھلی ۶

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ - ۹۵۵

نام کتاب: ٹیپو سلطان
مصنف: ڈاکٹر عبد المغنی
ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳ چتلی قبر، دہلی ۶
صفحات: ۶۸
اشاعت:
باراول ۱۹۹۱ء تا باردوم ۱۹۹۲ء ۴۰۰۰
بارسوم ۱۹۹۴ء ۲،۰۰۰

-/۸ قیمت : -/۸ روپے

مطبوعہ
دعوت آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۶

فہرستِ ابواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُلطان ٹیپو کی وصیّت

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز!
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں!
محفل گداز! گرمئ محفل نہ کر قبول!

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دِل نہ کر قبول!

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

(ضربِ کلیم — اقبال)

تاریخ کا مسئلہ

تاریخ ایک قدیم ترین علم ہے اور فلسفۂ تاریخ دنیا کو مسلمانوں کی دین ہے، اس لیے کہ قرآنِ حکیم کے محکم تصورِ تاریخ سے متاثر ہو کر عہدِ وسطیٰ میں سب سے پہلے ایک مسلمان مورّخ، علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں فلسفۂ تاریخ مرتب کیا اور بعد کے تمام مورخوں نے اس مسلم مورخ کے طرزِ فکر سے خوشہ چینی کی۔ اس حقیقت کا اعتراف عصرِ حاضر کے ایک عظیم ترین مغربی مورّخ، آرنلڈ ٹوائن بی، نے بھی کیا ہے، بلکہ اس کا مطالعۂ تاریخ ابنِ خلدون ہی کے نظریات پر مبنی ہے۔ تاریخ کا فلسفہ ایک لفظ میں عبرت ہے اور اس کا نتیجہ بصیرت۔ ماضی کے واقعات زمانۂ حال میں انسان کی رہ نمائی کر سکتے ہیں، بہ شرطے کہ ان سے صحیح طور پر کچھ اخلاقی سبق حاصل کیے جائیں۔ قرآن مجید میں گزشتہ زمانوں، قوموں، ملکوں اور پیغمبروں کے بہ کثرت تذکرے بار بار اسی مقصد کے لیے کیے گئے ہیں۔

لیکن عصرِ حاضر میں مغربی مورخوں اور ان کے مشرقی شاگردوں نے تاریخ کو ایک مسئلہ بنا دیا ہے، خاص کر مغربی مورخوں نے مشرقی ملکوں کی جو تاریخیں لکھی ہیں ان کا ایک بڑا محرّک و مقصود ان ملکوں کی تاریخ کو مسخ

کرنا ہے اور اس ادنیٰ مقصد کے لیے ہر قسم کی تحقیق و تفتیش اور عبارت آرائی سے کام لیا گیا ہے، تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ تہذیب و تمدن کی ساری ترقیات دنیا کو اہلِ مغرب کی دین ہیں۔ یہ درحقیقت نودولتی کی ایک ذہنی الجھن ہے جس سے نجات پانے کے لیے اہلِ مغرب نے ایک غلط قسم کے احساسِ برتری میں مبتلا ہو کر اہلِ مشرق کو جان بوجھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا چاہا ہے، تاکہ مشرق ہمیشہ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا رہے۔

مغربی مورخوں نے اپنے اس ہتھکنڈے کا سب سے زیادہ استعمال تاریخِ مشرق کی ان ملتوں اور شخصیتوں کے مقابلے میں کیا ہے جن کا رعب ان مورخوں کے دل و دماغ پر طاری ہوا، اس لیے کہ ان ملتوں اور شخصیتوں کی علمی و عملی فتوحات اس دورِ جدید میں اہلِ مشرق کے لیے عزم و جرأت کا نمونہ بن سکتی تھیں جس پر اپنا غلبہ قائم کرنے کے لیے اہلِ مغرب بے قرار تھے اور ڈرتے تھے کہ ان کے بے پناہ مادّی وسائل پر مبنی اقتدار کی راہ میں اگر کوئی چیز مزاحم ہوسکتی ہے تو یہی عزم و جرأت کا نمونہ ہے، لہٰذا اس پر پردہ ڈالنے کے لیے پوری تاریخ کو مسخ کر دیا گیا۔ اسی مجرمانہ تاریخ نویسی کا نتیجہ ہے کہ آج مشرق کی عظیم ترین شخصیتوں کے صحیح حالات کا علم آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ حد یہ ہے کہ تاریخ کو غارت کرنے کے لیے مغربی مورخوں اور محققوں نے آثارِ قدیمہ اور دستاویزات تک کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ٹیپو سلطان کی شخصیت

مغربی مورخوں نے سب سے زیادہ ظلم دورِ جدید کی ان مشرقی شخصیتوں پر کیا ہے جن کے ساتھ انہیں یعنی ان کی قوم یا قوموں کو اپنی نوآبادیاتی اغراض اور سامراجی عزائم کے لیے جنگی مقابلے کرنے پڑے ہیں۔ ہندوستان میں برطانیہ کی نوآبادکار ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایسا ہی ایک سخت مقابلہ ٹیپو سلطان سے کرنا پڑا۔ بنگال میں سراج الدولہ کو زیر کرنے اور ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں فتح یاب ہونے کے بعد انگریزوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب پورے ہندوستان میں کوئی ریاست یا شخصیت ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ وہ شمالی ہند میں کام یابی کے ساتھ اپنی ریشہ دوانیوں کا جال پھیلا کر تصور کرتے تھے کہ جنوبی ہند سے ابھرنے والی مرہٹوں کی طاقت بالآخر ان کی سازشوں کا شکار ہو جائے گی، جب کہ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان (۱۷۶۱ء) میں اس طاقت کی کمر توڑ دی تھی۔ لیکن نواب حیدر علی کے تحت میسور میں سلطنتِ خداداد کے عروج نے انگریزوں کو پریشان کر دیا اور جب اس سلطنت کا ولی عہد، حیدر علی کا لائق و فائق فرزند، ٹیپو سلطان، تخت پر بیٹھا تو اس کی شجاعت و فراست

نے انگریزوں کے ہوش اُڑا دیے۔

ٹیپو حیدر علی کی ان فتوحات میں بھی سب سے آگے تھا جو اس کے باپ کو انگریزوں کے مقابلے میں حاصل ہوئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حیدر علی ہی کے زمانے میں انگریز ٹیپو سے بہت زیادہ خائف تھے، اس لیے کہ وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا مردِ میدان ہونے کے علاوہ ایک زبردست عالم، مجاہد، وطن پرور، شیدائے ملّت، انسانیت دوست اور روشن خیال انسان تھا۔ وہ اپنے وقت سے بہت آگے دیکھتا تھا۔ اس کی جرأت و فراست کا کوئی ہمسر مقابل اس کے دور کے مشرق میں نہیں تھا۔ اس نے بہ یک وقت جنگی و سیاسی تدبیر و تدبّر، تعلیمی ترقی، معاشی فلاح اور اخلاقی نظم و ضبط کا اہتمام کیا۔ بلاشبہ وہ ایک مردِ حق اور سلطانِ عادل تھا۔ عہدِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے درمیان اس کی کوئی نظیر شیر شاہ اور اورنگ زیب جیسے باکمالوں کے سوا نہیں۔ وہ غیروں اور اجنبیوں کے غلبہ و تسلّط کے مقابلے میں ملک ہندوستان اور ملّت مسلمہ کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد پوری اٹھارہویں صدی میں وہ ہندوستان کی آزادی کا سب سے بڑا پاسبان تھا۔ انگریز شاید اسے مشرق کا نپولین تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی زندگی میں وہ ہندوستان کو غلام نہیں بنا سکتے۔

لہٰذا ٹیپو سلطان کی تاریخی شخصیت کو مسخ کرنے میں انگریز مورخین نے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا اور ہر وہ الزام اس پر لگایا جو اُن کے سازشی

ذہن میں آسکا، حد یہ ہے کہ جن انگریز مورخوں نے حیدر علی تک کی بعض جہتوں سے تعریف کی انہوں نے بھی ٹیپو کی مذمّت ضروری سمجھی، "تاکہ ہندوستان اور مشرق کی آئندہ نسلیں سلطان شہید کو اہلِ مغرب کے سامراجی عزائم کے مقابلے میں ایک نمونے کی علامت نہ بنا لیں۔ اہلِ مغرب اپنے اس مقصد میں پوری طرح کام یاب رہے اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت کے بعد انیسویں سے بیسویں صدی تک دو سَو سال تک تاریخ ٹیپو کے ساتھ انصاف نہیں کر سکی۔

سُلطان شہید کی شخصیت کا اِحیاء

اس پسِ منظر میں مسٹر بھگوان، ایس، گِڈوانی نے اپنی وسیع و عمیق تحقیق و تفتیش کے بعد سلطان شہید کی شخصیت کے اِحیا کا بیڑا اٹھایا اور ۱۹۷۶ء میں "THE SWORD OF TIPU SULTAN" شایع کر کے انگریزی پڑھنے والوں کی دنیا میں سُلطان کی حقیقت و عظمت پر ڈالے ہوئے تاریک و دبیز پردے چاک کر دیے، جب کہ اس سے اٹھارہ ۱۸ سال قبل ہی نسیم حجازی نے اپنے معرکہ آرا تاریخی ناول "اور تلوار ٹوٹ گئی" (۱۹۵۸ء) میں سلطان کی اصلیت و اہمیت اچھی طرح واضح کر دی تھی اور دونوں ناولوں کے نام و نوعیت سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید گِڈوانی نے اپنے انگریزی ناول میں اُردو ناول سے اِستفادہ کیا یا کم از کم متاثر ہوا۔ بہرحال، گڈوانی نے اپنے ناول کے زیرِ عنوان قوسین میں حسبِ ذیل صراحت کی ہے:

"(ہندوستان کے ٹیپو سلطان کی حیات اور داستان کے متعلق ایک تاریخی ناول)"

اِس سلسلے میں سب سے دل چسپ اور فکر انگیز گڈوانی کے ناول کا مندرجہ ذیل انتساب ہے :

"— اس ملک کے نام جس میں ایک مورخ کی کمی ہے
— ان اشخاص کے نام جن کو صحیح مقام دینا تاریخ پر واجب ہے
— انسان کے مقدر پر ایمان کے نام
— اس اعتقاد کے نام کہ آفتاب مشرق میں طلوع ہوتا ہے

اور

— اپنے بیٹوں مَنو اور سَنجَل اور ہندوستان کے تمام نوجوانوں کے نام جن کے سامنے صداقت کا بیان ضروری ہے ۔"

اِس معنی خیز انتساب کا تجزیہ کرنے سے مذکور ذیل نکات معلوم ہوتے ہیں :

۱۔ آج تک ہندوستان میں کوئی ایسا مورخ نہیں پیدا ہوا جو ہندوستان کی اپنی تاریخ کے ساتھ انصاف کرتا، اسی لیے ٹیپو کی صحیح شخصیت بھی ہنوز سامنے نہیں آسکی ۔

۲۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہندوستانی تاریخ کے ہیروؤں کو، جن میں ٹیپو کا نام نہایت نمایاں ہے، ان کا صحیح مقام دیا جائے ۔

۳۔ ٹیپو کی سرگزشت اشارہ کرتی ہے کہ انسانیت کے علم بردار ہر

دَور اور ماحول میں انسان کے مقدر کی تعمیر کے لیے عزم وایثار اور حوصلہ و قربانی سے کام لیتے ہیں۔

۴۔ مشرق کا مقدر تابناک ہے، اس کا ماضی شان دار رہا ہے اور مستقبل بھی شان دار ہوسکتا ہے۔

۵۔ ہندوستان کی نئی نسلوں کو تاریخ کی سچائیوں کا علم واحساس دلایا جانا چاہیے، تاکہ وہ اپنے ورثے پر فخر کریں۔ اور اپنی روایات سے جذبہ وحوصلہ حاصل کرسکیں۔

اپنے پیش لفظ "مصنف کا نوٹ" میں "دی سورڈ آف ٹیپو سلطان" لکھنے والے مورخ نے بتایا ہے کہ اپنے موضوع پر تمام معلوم و نامعلوم، مطبوعہ وغیر مطبوعہ، مواد کی چھان بین کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹیپو کی عبرت انگیز داستانِ حیات ناول کی شکل میں بیان کی جانی چاہیے، تاکہ موجودہ زمانے کے انسان اس تہذیبی ماحول کو تصور کی نگاہوں سے دیکھ سکیں جس میں یہ داستان وقوع پزیر ہوئی اور ایک شان دار ماضی کے جیتے جاگتے مرقعے سے ان کے دلوں میں مستقبل کی بہتری کے لیے حوصلے بیدار ہوں، یعنی مصنف کا مقصد محض ایک شخصیت کو زندہ کرکے تاریخ میں اس کا صحیح مقام بحال کرنا نہیں ہے، بلکہ خود تاریخ کو ایک سبق آموز صورت میں پیش کرنا ہے:

"میں اس نوٹ کے پڑھنے والوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا کہ اس ناول کی تصنیف سے میرا واحد مقصد

ٹیپو سلطان کی جگہ قومی حافظے میں بحال کرنی ہے۔ جیسے جیسے اس موضوع پر میری تحقیق بڑھتی گئی تصنیف کا اس سے زیادہ اہم سبب پیدا ہوتا گیا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ماضی کے اندر ایک نمایاں میلان زمانۂ حال تک وسعت پزیر ہوتا ہے اور جب کبھی ہم ماضی کو بھول جاتے ہیں تو ہم کسی بنیاد کے بغیر ایک عمارت اٹھانے کا خطرہ مول لیتے ہیں اور قومی ترقی کی جڑیں کاٹ دیتے ہیں۔ ٹیپو کو بھی معلوم تھا کہ اپنے زمانے کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ماضی کو دریافت کرنے کی سیاحت ضروری ہے اور اپنے بدنصیب وطن کے ماضی کی تاریخ نے جو خاص سبق اس کو سکھایا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے کمزور ہو جانے کا باعث کوئی بیرونی طاقت اس حد تک نہیں تھی جس حد تک ہمارے اندر کا خطرہ، ہمارے اندر کی کمزوری اور ہمارے اندر کی وہ بیماری تھی جس کا نام نفاق ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا محبوب وطن ایک غیر فطری موت کے خطرے سے دوچار تھا، جو اندر کے دشمن کی جانب سے دھوکے کے قتل کا اقدام تھا۔ ٹیپو نے نہ صرف ایک تاریخی عمل کے اعادے کا مشاہدہ کیا تھا بلکہ مستقبل کے لیے ایک سبق بھی سیکھا تھا۔ میں قائل ہوں کہ وہ سبق جتنا ٹیپو کے دور میں صحیح تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔"

اس طرح گڈوانی نے اپنے ناول میں ٹیپو سلطان کو ایک منصف مزاج، مدبّر اور جری وطن دوست کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جو جنوبی ہند میں انگریزوں کے ساتھ صرف میسور کی نہیں، پورے ہندوستان کی جنگ لڑ رہا تھا، اسی لیے اس نے ایک طرف مرہٹوں اور نظام وغیرہ کے ساتھ غیر ملکی سامراجیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی انتہائی کوشش بار بار کی اور دوسری طرف انگریزوں سے نمٹنے کے لیے غیر ممالک کی بعض ہمدرد قوموں سے بھی مدد لینی چاہی اس لیے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے لوگ بہت پس ماندہ تھے اور ان کے پاس ایسے اسلحے اور فوجی تربیت کی سخت کمی تھی جن سے آراستہ ہو کر برطانوی نوآبادکار پورے شمالی ہند پر غالب آچکے تھے۔ اس سلسلے میں ٹیپو کی جرأت و بصیرت وسیع النظری، دور بینی اور سخت کوشی کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے وہ بہت پُر اثر ہے۔ گڈوانی کی یہ پیش کش کوئی افسانہ نہیں، ایک واقعہ ہے، جس کی ترتیب میں اس نے تحقیق کی جو داد دی ہے وہ ہندوستان یا دنیا کا کوئی مورخ آج تک نہیں دے سکا ہے۔ اس کے باوجود قوم پرستی کے نقطۂ نظر اور بعض شخصی تخیلات نے گڈوانی کو مجبور کیا کہ وہ بعض حقائق کو اپنے رنگ میں پیش کرے۔ مثال کے طور پر اس نے حیدر علی کے رفیق کار اور ٹیپو سلطان کے دست راست، پنڈت پرنیا، کو وفاداری کے جس معیار کا حامل دکھایا ہے اس کی تصدیق واقعات سے نہیں ہوتی۔

ٹیپو سلطان کی زندگی پر نسیم حجازی کا ناول "... اور تلوار ٹوٹ گئی"

واقعات کی تحقیق اور جذبات کی تحریک، دونوں اعتبار سے گڈوانی کے "دی سورڈ آف ٹیپو سلطان" پر فوقیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ نسیم حجازی کا مقصد تاریخ نویسی نہیں، چند اعلیٰ مقاصد کی تبلیغ ہے، لیکن اول تو انہوں نے اپنے مواد کی صداقت کا یقین کر لیا ہے اور اس سلسلے میں حقائق کی چھان بین اچھی طرح کر لی ہے، دوسرے فنی اعتبار سے بھی ان کا ناول ایک اعلیٰ پائے کی تخلیق ہے، جس میں بہترین ماجرا سازی کے ساتھ ساتھ زبردست کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا ثبوت دیا گیا، جب کہ ہیرو کا زورِ خطابت بھی حالات اور مواقع کے مطابق ہونے کے سبب پُراثر ہے، اس لیے کہ ٹیپو خود ہی ایک صاحبِ فکر اور بامقصد مبلغ تھا، قول اور فعل دونوں کے لحاظ سے وہ ایک ایسی مثالی شخصیت کا حامل تھا کہ وعظ و نصیحت کا کام اسے زیب دیتا تھا۔ اس طرح نسیم حجازی کا ہیرو گڈوانی کے ہیرو سے زیادہ بھرپور شخصیت کا رکھتا ہے، زیادہ قد آور اور عظیم تر ہے۔ کتاب کے "پیش لفظ" میں مصنف کے بیانات بہت فکر انگیز ہیں، جن کے چند اقتباسات حسبِ ذیل ہیں:

"....شیرِ میسور کی فتوحات صرف جنگ کے میدانوں تک محدود نہ تھیں، بلکہ وہ بیک وقت ایک ایسا حکمراں، عالم، مفکر اور مصلح تھا، جس کے دل و دماغ کی وسعتوں میں اسلامیانِ ہند کے ماضی کی عظمتیں، حال کے ولولے اور مستقبل کی آرزوئیں سما گئی تھیں، وہ ہمیں زندگی کی ہر دوڑ میں اپنے وقت سے کئی منزلیں آگے دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ایک ایسے دور میں فلاحی ریاست کا نمونہ پیش

کیا تھا، جب کہ باقی ہندوستان کے نواب اور راجے اپنی رعایا کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کر رہے تھے۔ اس نے اس زمانے میں بین الاسلامی اتحاد کے لیے جدوجہد کی تھی، جبکہ عالمِ اسلام اپنے نااہل حکمرانوں کی تنگ نظری، کمزوری، بے حسی اور باہمی رقابتوں کے باعث مغرب کے سامراجی بھیڑیوں کے لیے ایک عظیم شکار گاہ بن چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کے ایک ایسے پسماندہ علاقے میں اسلامی عدل و مساوات کے جھنڈے گاڑے تھے جہاں صدیوں سے جہالت اور افلاس کی تاریکیاں مسلّط تھیں۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے قبل میسور کے عوام کی کوئی تاریخ نہ تھی، لیکن ان کی حکمرانی کے چند برس پورے ہندوستان کی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں۔

جب ہندوستان کے عوام اپنے حال اور مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے، تو میسور میں حوصلوں اور ولولوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ جب مشرقی ہندوستان کے قلعوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جھنڈے نصب ہو رہے تھے تو سلطنتِ خداداد کے یہ معمار سرنگاپٹم، بنگلور اور چیتل ڈرگ میں قوم کی آزادی کے نئے حصار تعمیر کر رہے تھے۔

...... شیرِ میسور نے اس وقت سلطنتِ خداداد کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ جب بھیڑیوں، گیدڑوں اور گدھوں،

کے لشکر اس کے کچھار کا محاصرہ کر رہے تھے اور وہ اس وقت تک ان کے سامنے سینہ سپر رہا جب تک کہ اس کی رگوں کا سارا خون میسور کی خاک میں جذب نہیں ہو چکا تھا۔

..... ان طویل اور صبر آزما جنگوں کا معمولی جائزہ ہمیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انگریزوں نے باقی ہندوستان پر تسلط جمانے کے لیے جو جنگیں لڑی تھیں وہ اپنی شدت اور وسعت کے اعتبار سے میسور کے معرکوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ہندوستان کی پوری تاریخ میسور کے مجاہدوں کے صبر و استقلال اور ایثار و خلوص کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

..... ایسٹ انڈیا کمپنی پلاسی اور بکسر کی نمائشی جنگوں کے بعد کلکتہ سے لے کر لکھنؤ تک اپنی فتوحات کے جھنڈے نصب کر دیتی ہے ــــ لیکن میسور میں ٹیپو سلطان کی تلوار کے سامنے انگریزی جارحیت کا سیلاب رک جاتا ہے اور مسلسل سولہ برس تک ایسٹ انڈیا کمپنی جنوب سے دلّی کی طرف کوچ کرنے کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔

میسور کی دفاعی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میسور کے بعد جب مرہٹوں کی باری آئی تو سندھیا، بھونسلے اور ہلکر، جن کی افواج کی مجموعی تعداد میسور سے کہیں زیادہ تھی، چند

ماہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقابلہ نہ کر سکے۔

..... ٹیپو سلطان نے جن لوگوں کو آزادی کی تڑپ عطا کی تھی ان کا ماضی صرف پس ماندگی، غربت اور جہالت کے تذکروں تک محدود تھا۔ میسور کی بیشتر آبادی غیر مسلم تھی۔ ہندو سماج میں ان فرومایہ لوگوں کو ان بہادر راجپوتوں یا جنگ جو مرہٹوں کی برابری کا دعویٰ نہ تھا، جو اپنے اسلاف کے کسی کارنامے پر فخر کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑا کر کے کئی برس انگریزوں، مرہٹوں اور حیدرآباد کی سلطنتوں کا مقابلہ کرنا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

..... میسور کی جنگ آزادی صرف ایک اولوالعزم حکمراں کی جنگ نہ تھی، بلکہ صدیوں کے ان پس ماندہ، مظلوم اور بے بس انسانوں کے ذوقِ نمود کا مظاہرہ تھا جنہیں سلطان شہیدؒ نے جہالت اور افلاس کی دلدل سے نکال کر تہذیب و اخلاق کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ یہ داستان ان سرفروشوں کی ہمت، شجاعت اور ایثار کی داستان ہے جنہیں ایک صحیح الخیال مسلمان حکمراں نے زندگی کے آداب سکھائے تھے.....'' (ص۹-۵)

نسیم حجازی ایک مستند تاریخی ناول نگار ہیں جو بلا تحقیق اور بے بنیاد داستان گوئی نہیں کرتے، وہ جو کچھ لکھتے ہیں پوری ذمّے داری اور سنجیدگی کے ساتھ اور واقعات و حقائق کی جو تعبیر و تشریح وہ کرتے ہیں اس میں ان کے

تبلیغی مقاصد اور ملّی جذبات کے ساتھ ساتھ اصولی تصورات اور اخلاقی احساسات بھی ہوتے ہیں۔ ناول نگار ہونے کے باوجود وہ ایک بہترین مورّخ کی نگاہ رکھتے ہیں اور ان کے تجزیے میں عمرانی رنگ ہوتا ہے۔ لہٰذا ٹیپو سلطان کی اہمیت و عظمت اور کمالات و خدمات کے متعلق انہوں نے مندرجہ بالا بیانات میں جو کچھ کہا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے اور اس کا مطلب صاف صاف یہ ہے کہ:

۱۔ ٹیپو سلطان کی شخصیت تاریخِ ہند میں منفرد اور عہدِ وسطیٰ میں ممتاز ہے۔

۲۔ وہ ایک عظیم محبِ وطن ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع النظر اسلام پسند بھی تھا۔

۳۔ ایک بہترین جنرل اور کمانڈر ہونے کے علاوہ ٹیپو نہایت دور بین سیاست داں اور مدبّر تھا۔

۴۔ سیاست و حکومت سے آگے بڑھ کر اس نے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا۔

۵۔ اس نے ہندوستان کی پس ماندہ ذاتوں کو سماج میں اعلیٰ ذاتوں کے برابر جگہ دے کر ملک کو انسانی اخوت اور اسلامی مساوات کا پیغام دیا۔

۶۔ اس کی معاشرتی اصلاحات اس کی فوجی فتوحات سے کم نہیں۔

۷۔ وہ آفاقی قدروں کا حامل، بین المللی رابطوں کا علم بردار اور ایک نئے دَور کا پیام بر تھا۔

سلطنتِ خداداد

میسور میں نواب حیدر علی اور اس کے نامور فرزند سلطان فتح علی ٹیپو کی قائم کی ہوئی سلطنتِ خداداد پر "تاریخِ سلطنت خداداد (میسور)" کے نام سے بہترین تاریخ محمود خاں محمود بنگلوری کی ہے، جو آج سے پچپن ۵۵ سال قبل ۱۹۳۵ء میں شائع ہو کر اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ ۳۹ئہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آیا۔ یہ ایک ضخیم و مبسوط تصنیف ہے جس میں تفصیل سے موضوع کے متعلق تمام ضروری امور درج کر دیے گئے ہیں، اگرچہ اس کا طول اور قدرے انتشار اس کے عام مطالعے میں مانع ہے۔ شاید اسی لیے اب یہ کتاب متداول اور مروج نہیں، بلکہ بازار سے غائب اور گویا گم ہو چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی مستند تاریخ نویس اس کے مواد کو اختصار اور ترتیب کے ساتھ، زیادہ سلیس زبان میں، پیش کر کے ایک بار پھر اسے عام قارئین کے لیے سہل الحصول بنا دے، اس لیے کہ یہ ایک دستاویزی کوشش ہے، جس میں اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ کا بہت اچھا مواد پایا جاتا ہے۔

"سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے کتاب کے پیش لفظ میں مصنف نے عہدِ وسطیٰ اور اس کے بعد کمپنی کے وقت تک کی تاریخوں میں تعصبات و انحرافات کا بجا طور سے شکوہ کرتے ہوئے اس "ضرورت" کا اظہار کیا ہے کہ

"ہندوستان کی ایک صحیح اور اصل تاریخ لکھی جائے"؛

یہ ضرورت آج تک پوری نہیں ہوئی ہے، اس لیے کہ ملک میں جو لوگ مورخ تسلیم کیے جاتے ہیں وہ ابھی تک انہی انگریزوں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں جنہوں نے دوسرے مشرقی ملکوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تاریخ بھی مسخ کرکے رکھ دی ہے۔

کتاب کے "مقدمہ" میں مصنف نے حسبِ ذیل حقایق کا اعلان کیا ہے:

"....خاکِ ہندوستان سے اُٹھ کر سب سے پہلے جس شخص نے "ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے" کا کلمۃ الحق بلند کیا وہ سلطان ہے..... اس نے اپنی پوری توجہ اتحاد بین المسلمین اور اتحاد بین الاقوامِ ہند پر صرف کر دی۔ ملک کی صنعت وحرفت پر پوری توجہ کی کہ ہندوستان کہیں غیر ممالک کا محتاج نہ ہو جائے۔ سلطان کے یہی عزم و ارادے تھے جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سلطان کا مخالف بنا دیا اور اسی مخالفت نے اس کو تمام عمر جنگوں میں مصروف رکھا۔ مگر باوجود اس کے سلطنتِ خداداد میسور نے صنعت وحرفت اور دیگر فنون میں۔ جو ترقی کی وہ میسور کو کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جان چکی تھی کہ اگر سلطان کو اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے دیا جائے تو پھر ہندوستان پر ہرگز قبضہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے حیدر آباد اور مرہٹوں

کو اپنا کر جو کچھ کیا اس کی خود تاریخ شاہد ہے۔ اس لحاظ سے سلطان ہی وہ پہلا شخص ہندوستان میں گزرا ہے جو استعمارِ فرنگ سے ہندوستان کو آزاد اور محفوظ رکھنا چاہتا تھا یا بالفاظِ دیگر ہند کا سچا خیر خواہ اور محبِ وطن تھا۔ اس لیے تاریخ میں اس کو ایک ایسا بلند مرتبہ حاصل ہے جو ہندوستان میں اب تک کسی حکمران کو نصیب نہیں ہوا۔

دنیا کی تاریخ بمشکل ٹیپو کی نظیر پیش کر سکے گی ... اگر زمانہ اس اولوالعزم سلطان کے ارادوں کو پورا ہونے دیتا تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

.... (بہ حوالہ پروفیسر جائیسر) اس کے حریف ہمیشہ اس کے مٹانے پر آمادہ اور اندرونِ سلطنت اس کے خاص افسر ہمیشہ اس کے زوال کے لیے سازشیں کرتے رہے۔ مگر یہ سلطان ہی کا دل و گردہ تھا کہ سترہ سال تک ان سب کا نہایت خوبی اور کامیابی سے مقابلہ کیا۔" (ص ۱۶-۲)

اس خراجِ عقیدت کا ماحصل یہ ہے:

۱۔ ٹیپو سلطان ملک کا پہلا مجاہد آزادی تھا۔

۲۔ اس کی حکومت بلا امتیاز تمام ہندوستان کے لیے ایک رحمت تھی۔

۳۔ اس نے ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے منصوبہ بند، منظم اور مؤثر کوشش کی۔

۴۔ اس کی پوری زندگی مشکلوں اور مقابلوں میں گزری۔

۵۔ غیروں نے اس پر پیہم حملے کیے اور اپنوں نے اس کے خلاف مسلسل سازشیں کیں۔

۶۔ ان حالات میں بھی وہ سترہ ۱۷ سال تک ہندوستان کے تحفظ و ترقی کے لیے دلیرانہ جد و جہد کرتا رہا۔

۷۔ اگر اسے سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور اہلِ وطن نے اس کے ساتھ تعاون کیا ہوتا تو آج ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا، غلامی کی تاریکی اس پر طاری نہیں ہوتی اور آزادی کی روشنی میں اس کا ہر ممکن فروغ و عروج ہوتا۔

——— ❖ ———
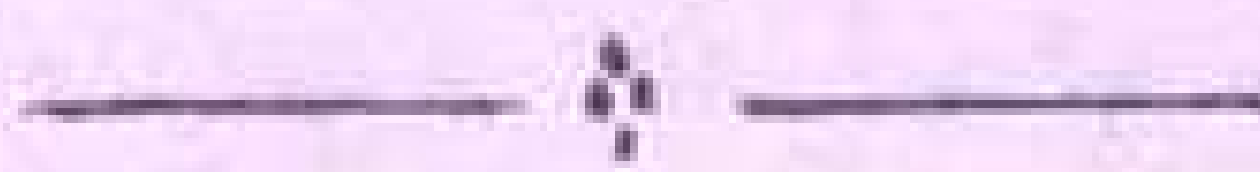
اٹھارہویں صدی کا ہندوستان

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا زوال شروع ہوگیا۔ یہ گویا مسلمانوں کے تحت عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کے عروج کے بعد تقابلِ عروج (ANTI-CLIMAX) کا واقعہ تھا۔ تقریباً سات سو سال قبل جب سندھ اور ملتان کے ابتدائی تجربے کے بعد مستقل اور مسلسل طور پر برصغیر میں مسلمانوں کی فرماں روائی کا آغاز ہوا تھا تو اس وقت دنیا کے نقشے پر ہندوستان نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پراچین بھارت یا آریہ ورت بہت قبل ختم ہوچکا تھا اور ملک چھوٹے چھوٹے دیسوں یا ریاستوں میں بٹ کر بکھر چکا تھا۔ ایک عام مزاج کی کیفیت تھی، سماج مکمل انتشار سے دوچار تھا، تہذیبی قدریں مٹ رہی تھیں اور انسانیت کا تمدن خطرے میں تھا۔ ایسی حالت میں غوری، غزنوی، خلجی اور لودھی حملوں اور حکومتوں کے بعد بالآخر مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑی اور اکبر سے اورنگ زیب تک پورا برصغیر ایک ملک ہندوستان بن کر، جس کی سرحدیں کابل سے تبت تک وسیع تھیں، ہر قسم کی سیاسی، معاشی، فوجی، علمی اور سماجی ترقی کی اتنی بلند چوٹی پر پہنچ گیا جہاں سے پوری دنیا حقیر نظر آنے لگی۔ اس وقت ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا اور سارے عالم کے بہترین مادی و انسانی وسائل برصغیر میں مرکوز ہوگئے۔ چنانچہ ہر قوم اور ملک کے اولوالعزم افراد کی نگاہیں اس کے اُفق کی طرف اُٹھنے لگیں۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آرہا تھا۔

یورپ کے مورخوں نے عہدِ وسطیٰ (MEDIAEVEL AGE) کو قرونِ مظلمہ (DARK AGES) اسی لیے قرار دیا ہے کہ اس وقت مغرب جہالت، افلاس اور وحشت و پس ماندگی کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا، جب کہ پورا مشرق مسلمانوں کی فرماں روائی میں علم، دولت، تہذیب اور ترقی کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ لیکن ساتویں صدی سے سترھویں صدی عیسوی تک پورے ایک ہزار سال میں مسلمانوں نے اسلام کے پرچم تلے سارے جہاں کی جو بے مثال قیادت کی تھی اس کا دورِ رحمت اٹھارہویں صدی میں ختم ہو رہا تھا۔ تاریخ کا یہی وہ لمحہ تھا جب انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں، جس کا ایک نام برطانوی جزیرہ (BRITISH ISLE) بھی ہے، صنعت و حرفت اور تجارت و معیشت کی مادی ترقی ہونے لگی۔ ایک صنعتی انقلاب (INDUSTRIAL - REVOLUTION) وقوع پذیر ہوا، جس کے سبب برطانوی سیاست نے نوآبادکاری (COLONIALISMS) کا سامراجی (IMPERIALISTIC) رُخ اختیار کیا۔ چنانچہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کو فروغ ہونے لگا، جس کے نتیجے میں استعمار و استحصال کی وبا پھوٹ پڑی۔ یہی وہ روگ تھا جس کو لے کر انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں وارد ہوئی اور اس کی تاجرانہ سیاست نے اس ملک کو ہر قسم کی بدترین سازشوں اور دغابازیوں سے کام لے کر غارت کرنا شروع کیا۔

انگریزوں سے پہلے پرتگالیوں، ولندیزیوں (ڈچ)، اور فرانسیسیوں نے ہندوستان کے مختلف ساحلی مقامات پر اپنے اثرات قائم کر لیے تھے۔ ان میں خاص کر آخر الذکر کے ساتھ جنوبی ہند میں انگریزوں کا تصادم ہوا۔ ۱۷۴۶ء سے

۱۷۶۳ء تک تقریباً بیس سال کرناٹک کی سرزمین پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کی لڑائیاں ہوتی رہیں، جن میں بالآخر انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی اور وہ مشرقی ہند کی طرح جنوبی ہند میں بھی سب سے بڑے غیر ملکی نوآبادکار بن گیے، بلکہ شمالی ہند میں ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر جیتنے کے بعد انگریز ملک کی سب سے بڑی طاقت بننے لگے۔ اب اگر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قیام میں کوئی رکاوٹ تھی تو صرف جنوب کی طرف سے جہاں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد تین ملکی قوتیں ابھر رہی تھیں، ایک مرہٹہ، دوسرے نظام اور تیسرے حیدرعلی۔ نظام کی ابن الوقتی نے اسے ایک محدود ریاست سے آگے بڑھ کر کوئی قومی طاقت نہیں بننے دیا، جب کہ مرہٹوں کی قبائلی تنگ نظری نے ان کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ لہذا مستقبل کے لیے ملکی سطح پر انگریزوں نے اگر کسی کو حریف تصور کیا تو وہ میسور کا نواب حیدرعلی ہی تھا اور اسی کی جرأت و فراست نے برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کیا۔

ریاست میسور

جنوبی ہند میں حیدرعلی کے عروج سے پہلے صوبہ سرا کے اندر ایک چھوٹی سی ہندو ریاست کا نام میسور تھا، جو آخر آخر سمٹ کر ایک شہر سرنگاپٹم کے ساتھ اس کے مضافات میں صرف ۳۳ دیہات پر مشتمل تھی۔ لیکن حیدرعلی نے اپنی فتوحات، تدبّر اور حسنِ انتظام سے اسے وسعت دے کر اتنی بڑی اور اتنی مضبوط ریاست بنا دیا کہ جنوب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مرکز، مدراس، کو یہ نہ صرف جنوب بلکہ پورے ہندوستان میں اپنی اصلی حریف نظر آنے لگی اور انگریزوں کو اندیشہ ہونے لگا کہ اگر ریاستِ میسور کو تابعِ فرمان نہیں بنایا گیا تو وہ برصغیر پر

اپنی سلطنت کے خواب کی تعبیر نہیں پا سکیں گے۔ لہٰذا انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر یا ان کو اپنے ساتھ ملا کر میسور کے خلاف ہر قسم کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

حیدر علی کی ولادت ۱۷۲۲ء میں اور وفات ۱۷۸۲ء میں ہوئی ۱۷۵۶ء میں حیدر علی کو میسور کی افواج کا سپہ سالار بنایا گیا اور صرف چار۴ سال کے اندر ۱۷۶۱ء میں قلعہ ہوسکوٹہ پر قابض ہونے کے بعد وہ پورے صوبہ سرا پر غالب آ گیا، جس کے نتیجے میں اسے مغلیہ دربار سے صوبہ داری کے فرمان کے ساتھ ساتھ نواب کا خطاب ملا۔ گرچہ نواب حیدر علی نے ایک نئی اور وسیع ریاستِ میسور اپنی قوتِ بازو سے بنائی تھی مگر وہ اسے تائیدِ ایزدی کی دین سمجھتا تھا، اس لیے کہ ایک معمولی سپاہی کے عہدے پر ترقی پا کر نوابی کے منصب تک پہنچنا اس کے دینی عقیدے کے مطابق توفیقِ الٰہی کا کرشمہ تھا۔ لہٰذا حیدر علی کے زیرِ نگیں ریاست میسور کو آج تاریخ سلطنتِ خداداد کے نام سے جانتی ہے۔

جس زمانے میں یہ سلطنت قائم ہوئی وہ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کے بعد جنوبی ہند میں مستقبل کے ہندوستان پر قبضے کے لیے ایک طرف مرہٹہ اور نظام، جب کہ دوسری طرف برطانیہ اور فرانس کی کشمکش کا دور تھا، جس میں سب کے مقابلے پر انگریزوں کا پلّہ زیادہ تر ان کی چال بازیوں کے سبب بھاری ہو رہا تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ اپنے حریفوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر بالآخر ہی پورے

خطّے پر قابض ہوجائیں گے۔ وہ ملک کے مشرقی کنارے پر علی وردی خاں کے بعد سراج الدولہ کو مکاری اور دغابازی سے شکست دے چکے تھے، اَوَدھ کے نواب کو بہادر روہیلہ پٹھانوں سے لڑاکر کم زور کرچکے تھے اور ابدالی نے مرہٹوں کی کمر توڑدی تھی، نظام کی ہوسِ اقتدار کو بجھا کر اسے اپنی جھولی میں ڈال لینے کا گُر بھی انگریزوں کو معلوم ہوچکا تھا، آرکاٹ کا نواب پہلے ہی ان کی جیب میں تھا۔ اس صورتِ حال میں میسور سے نواب حیدرعلی کا عروج اور اس کے بعد ٹیپو سلطان کا فروغ ہی برطانوی سامراج کے نو آبادیاتی عزائم کے لیے واحد چیلنج تھا۔

اِس چیلنج کا مقابلہ ایسٹ انڈیا کمپنی محض اپنے قلعۂ مدراس سے نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا اس کو اتنی اہمیت دی گئی کہ نہ صرف کلکتہ اور بمبئی سے انگریزی لشکر یا افسر بلائے گئے بلکہ انگلستان میں مشورے ہوتے، منصوبے بنے اور یکے بعد دیگرے کتنی نامور مدبّر، منتظم اور کمان دار میسور کی مہم سر کرنے کے لیے بھیجے گئے جنہیں ایک مدّت تک حیدرعلی اور ٹیپو نہایت ذلت آمیز شکستیں دیتے رہے، یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبی کی طرح ٹیپو سلطان کا ایک ہوّا سا برطانوی سامراجیوں کے ذہن پر مسلّط ہوگیا اور وہ پورے ہندوستان بلکہ انگلستان سے اپنے بے پناہ فوجی، صنعتی اور سیاسی وسائل و ذرائع سمیٹ کر میسور کے محاذ پر بڑھنے لگے، انہوں نے مشرقی اور شمالی ہند نیز مغربی ہند میں مسلسل پیش قدمیاں کرتے ہوئے جنوبی ہند کی سلطنتِ خداداد، ریاست میسور کے گرد اپنا حصار

تنگ سے تنگ تر کرنا شروع کر دیا اور بالآخر قلعۂ سرنگا پٹم میں شگاف ڈالنے میں وہ صرف اندرونی غدّاروں کی زر خرید کارستانیوں کے سبب کام یاب ہوئے۔

ٹیپو سلطان

حیدر علی کے آبا و اجداد پنجابی ہوں یا افغانی یا قریشی، وہ ایک ہمّت ور اور حوصلہ مند مسلمان تھا اور اس نے جنگی فتوحات سے انتظامی اصلاحات تک بالعموم اسلامی اصولوں پر اور شرعی حدود میں کام کیا، گرچہ وہ ایک تعلیم یافتہ انسان نہیں تھا، صرف فطرت کا تربیت یافتہ تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کے واقعات کی تحقیق اس کے سیرت نگار کا فرض ہے۔ مورّخ کا قلم لکھتا ہے کہ اس نے اٹھارہویں صدی کے ایک نسبتاً پس ماندہ زمانے اور پُر آشوب دَور میں اپنے خلفِ اکبر اور ولی عہد، ابو الفتح فتح علی ٹیپو سلطان کی اپنی دوسری بیوی، فاطمہ بیگم، کے بطن سے ۱۷۵۲ء میں پیدائش کے بعد اس کی تعلیم و تربیت کا پختہ و مکمل انتظام کسی مغل شہزادے سے بھی بڑھ کر کیا۔ عربی، فارسی، سنسکرت، دینیات اور حربیات کی تعلیم ٹیپو نے اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے حاصل کی اور وہ بہت کم عمری میں ایک باشعور، باکردار، جری، قوی، مدبّر و منتظم، اور ہر فن مولا صالح نوجوان بن کر میدانِ عمل میں آیا۔ وہ نہ صرف اپنے بہادر باپ کا دست و بازو ثابت ہوا بلکہ اس کے خوابوں کی تعبیر بن گیا۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں شیر شاہ

اور اورنگ زیب کے سوا دوسرا کوئی ایسا عالم وفاضل اور مجاہد و مصلح انسان کسی سلطنت کے تخت پر نہیں بیٹھا۔ اپنے عہد کے حالات میں ٹیپو سلطان نے جو کارنامے انجام دیے ان کے لحاظ سے اس کا موازنہ ایک طرف مشرق میں سلطان صلاح الدین کے ساتھ تو دوسری طرف مغرب میں نپولین بونا پارٹ کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں ایوبی کا تعلق دورِ قدیم سے ہے اور نپولین کا دورِ جدید سے۔ چناں چہ ٹیپو کی ذات میں قدیم و جدید دونوں کی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں۔ اس کی یہ جامع شخصیت عصرِ حاضر کے لیے ایک نمونے کا کردار ہے۔

ٹیپو حلم و حیا، عفت و عصمت، غیرت و حمیت، شجاعت و صلابت، رحم و کرم اور محنت و مشقت کا ایک پیکر تھا۔ اس کی قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت اس کے مکاتیب ہیں جو اپنی جودت و کثرت کے لحاظ سے رقعاتِ عالمگیری سے کم نہیں۔ اس کی ریاضت و عبادت کا عالم یہ تھا کہ نوتعمیر مسجدِ اعلیٰ کی افتتاحی نماز کی امامت صاحبِ ترتیب ہونے یعنی کبھی کوئی نماز قضا نہ کرنے کے سبب اسی نے کی۔ اس کی جنگی مہارت کا لوہا اس کے دشمن بھی مانتے تھے۔ وہ جہاد و مجاہدہ دونوں میں مجاہد اور مردِ میدان تھا۔ اس کی ذاتی زندگی بہت سادہ تھی اور اس نے اپنے دربار میں بادشاہت کے مروّجہ شاہانہ مراسم، مثلاً فرشی سلام وغیرہ منسوخ کردیے تھے۔ سماج میں پھیلی ہوئی بدعتوں کا بھی اس نے سدِّ باب کردیا تھا، جبکہ کاروبارِ سلطنت کو ہر قسم کے مظالم سے پاک کرکے رعایا پروری اور عوامی

صلاح و فلاح کا ایک نظام اس نے قائم کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ بے تعصبی اور مذہبی رواداری بھی ٹیپو کی ایک امتیازی شان ہے۔ والدین کی اطاعت بھائیوں کی خیر خواہی اور دوستوں کے ساتھ وفاداری میں اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

ٹیپو شخصی وجاہت اور رعب و وقار کا ایک مجسمہ تھا۔ اس کی متانت کا پورے ماحول پر اثر تھا۔ عوام اس سے نہ صرف بے پناہ محبت کرتے بلکہ مبالغہ آمیز عقیدت رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسے ولی اللہ سمجھتے تھے۔ اس کی پاک بازی اور پرہیزگاری کے چرچے عام تھے۔ حسنِ تدبیر کے سبب ایک مدت تک اسے ناقابلِ شکست تصور کیا جاتا رہا۔ کم عمری ہی سے وہ اپنے باپ حیدر علی کی فوج کا سب سے نامور جنرل سمجھا جانے لگا۔ اس کی مہمات پر لوگ معجزات کا گمان کرنے لگے تھے۔

میسور کے ساتھ انگریزوں کی چار جنگیں

بنگال میں آسانی سے کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے پورے ہندوستان کو نرم چارہ سمجھ لیا۔ ۱۷۶۶ء میں انہوں نے نظام حیدرآباد کے ساتھ حیدر علی کے خلاف ایک معاہدہ کر لیا۔ آرکاٹ کے نواب اور مرہٹوں سے حیدر علی کے کچھ جھگڑے پہلے سے چل رہے تھے۔ اس طرح اب حیدر علی کو جنوب میں اپنے تمام ملکی و غیر ملکی دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔ اس وقت ٹیپو سلطان کی عمر صرف سولہ سال تھی، مگر وہ میدانِ جنگ میں ایک

دستے کا کمان دار بنایا گیا۔ ۱۷۶۶ء سے ۱۷۶۹ء تک انگریزوں کے ساتھ ریاست میسور کی پہلی جنگ ہوئی جس میں ٹیپو نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور دنیا کو معلوم ہوا کہ میسور کے کچھار سے ایک نیا شیر ہندوستان پر حملہ آور گیدڑوں سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آگیا ہے۔ اس جنگ میں اوّل تو حیدر علی نے اپنی تدبیروں سے جنگ کے وقت انگریزوں کو تقریباً تنہا کردیا، دوسرے وہ انہیں ہراتا اور رگیدتا ہوا مدراس میں ان کے قلعے کے دروازے تک لے گیا۔ جہاں پہنچ کر انگریزوں نے ایک نہایت ذلّت آمیز شکست تسلیم کرلی اور میسور کے ساتھ اس کی شرطوں پر صلح کرنے کے لیے مجبور ہوئے۔ صلح نامے میں آئندہ کسی حملہ آور دشمن کے خلاف مدد کرنے کی شرط بھی تھی۔ انگریزوں کے جنوبی دارالسلطنت کے دروازے پر جس فاتح ہندوستانی لشکر نے دستک دی وہ ٹیپو سلطان کے زیرِ کمان تھا اور سلطنت خداداد کا مصنّف لکھتا ہے کہ حیدر علی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا حریف و فریق نہ مان کر براہِ راست شاہ انگلستان کے ساتھ معاہدۂ صلح پر دستخط کیے۔

انگریزوں نے حیدر علی کے ساتھ صلح نامے کے برخلاف وعدہ خلافی کی اور ۱۷۷۱ء میں جب مرہٹوں نے میسور پر حملہ کیا تو کمپنی نے ریاست کی مدد نہیں کی، بلکہ میسور کے زیرِ نگیں بندرگاہ، ماہے، پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد حیدر علی نے اپنی فراست سے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملا کر ۱۷۸۰ء میں کرناٹک پر، جو انگریزوں کی سازشوں کا گڑھ بنا ہوا تھا،

حملہ کر دیا۔ اس طرح میسور کی انگریزوں کے ساتھ دوسری جنگ کا آغاز ہوگیا۔ لیکن اس جنگ کے دوران کمپنی کی ریشہ دوانیوں کے سبب نظام اور مرہٹے حیدر علی سے الگ ہوگئے۔ چنانچہ ۱۷۸۱ء میں پورٹو نووو کی یورش میں انگریزوں کو چھوٹی سی فتح حاصل ہوگئی، لیکن دوسرے ہی سال ۱۷۸۲ء میں حیدر علی نے انہیں شکستِ فاش دی اور انگریزی فوج کے کمانڈر، کرنل بریتھ ویٹ، کو قید تک کر لیا۔ اس کے بعد ہی حیدر علی کی وفات ہوگئی اور ولی عہد ٹیپو سلطان اس کا جانشین قرار پایا۔ ٹیپو نے پورے اعتماد کے ساتھ جنگ جاری رکھی، مگر اپنی صلح پسند طبیعت کے سبب مزید خوں ریزی اور غارت گری روکنے کے لیے اس نے ۱۷۸۴ء میں انگریزوں کے ساتھ معاہدہ منگلور کے صلح نامے پر دستخط کر دیے۔

بہر حال، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ رزم آرائیوں میں ٹیپو سلطان کی مسلسل فتوحات کا سلطنتِ انگلستان پر اتنا زبردست اثر پڑا کہ وزیر اعظم پٹ نے برطانوی پارلیمنٹ کا پہلا انڈیا ایکٹ ۱۷۸۴ء میں منظور کرایا، جس میں ہندوستانیوں کے ساتھ امن اور کمپنی کے مقبوضات کی عدم توسیع کی آئندہ پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ لیکن یہ ایکٹ برطانوی مکّاری اور دغا بازی کا ایک شاہکار ثابت ہوا اور معلوم ہوا کہ اس کا واحد مقصد شیرِ میسور کو غافل کر کے ہندوستان کی آزادی پر کاری ضرب لگانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے ایک بار پھر مرہٹوں اور نظام کو اپنے ساتھ ملا کر ریاست میسور کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ یہ واقعہ ۱۷۹۰ء میں ہوا ٹیپو سلطان نے خطرے کی سنگینی

کو اچھی طرح بھانپ لیا اور پہلے ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اس کے ساتھ انگریزوں کی ہر صلح ایک جنگ کا پیش خیمہ ہے، جس کا مقصد تازہ دم ہو کر ریاستِ میسور کو مٹانے کے لیے نئی فوج کشی ہے، اس لیے کہ اب برطانوی سامراج کے توسیعی عزائم کی راہ میں وہی ایک چٹان باقی رہ گئی ہے، جب کہ نظام اور مرہٹے ملک کے مفاد سے بالکل غافل ہو کر صرف اپنے اقتدار کو بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک دُور بیں مدبّر کی طرح اس نے ۱۷۸۴ء ہی میں خلافت عثمانیہ سے مدد طلب کرنے کے لیے اپنا سفیر استنبول بھیج دیا تھا، اس کے بعد ۱۷۸۷ء میں اس نے شاہ فرانس سے بھی تعاون حاصل کرنے کے لیے سفارت روانہ کی۔

ٹیپو ایک بیدار مغز اور اولوالعزم حکمراں تھا۔ وہ ہر معاملے میں دفاعی کے بجائے اقدامی انداز اختیار کرتا تھا اور اپنی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کے منڈلاتے ہوئے خطرات کا بھی سدِّباب کرنے کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ چناں چہ جب ٹراونکور کے راجہ نے ریاست کوچین میں جیکوٹائی اور کرنگانور ڈچوں سے خرید لیا تو ٹیپو نے اپنی باج گزار ریاست میں اسے ایک مداخلتِ بے جا قرار دے کر ۱۷۹۰ء میں ٹراونکور پر حملے کا فیصلہ کر لیا۔ انگریزوں نے ٹراونکور کے ساتھ اپنے معاہدہ کا بہانہ بنا کر ٹیپو کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے ریاست میسور کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تیسری جنگ کا آغاز کر دیا۔ مرہٹوں اور نظام نے کمپنی کا ساتھ دیا۔ اس متحدہ محاذ کا مقابلہ کرنا تنہا میسور کے لیے آسان

نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں فوجوں کی دست برد سے عاجز آ کر ۱۷۹۲ء میں ٹیپو نے معاہدہ سرنگا پٹم پر دستخط کر کے تقریباً اپنی آدھی سلطنت کھو دی، گرچہ اسے اُمید تھی کہ وہ جلد ہی اپنے نقصانات کی تلافی کر سکے گا۔ یہ اُمید اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ مجبوری کی مصالحت کی شرائط کے طور پر ٹیپو نے نہ صرف تاوانِ جنگ ادا کیا بلکہ اپنے دو لڑکے بھی یرغمال کی حیثیت سے دشمن کے حوالے کر دیے۔

عوامی تائید اور ان تھک کوشش سے ٹیپو نے بہت جلد اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کر لی، اس کے خالی خزانے پھر بھر گئے، سلطنت نئے سرے سے خوش حال ہو گئی اور برطانوی سامراج کو شدت سے محسوس ہونے لگا کہ ایک زخمی شیر تن درست ہو کر نو آبادکاروں کے لیے اور زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔ انگریز اپنی ہندوستانی پالیسی کے مطابق چند سال کی جنگ بندی کے بعد اپنے استعماری ارادوں کی تکمیل کے لیے تازہ دم ہو گئے۔ اپنی تیاری کے لیے امن کا جو وقفہ انہیں درکار تھا وہ ختم ہو گیا۔ پھر فرانس کے ساتھ انگلستان کی بڑھتی ہوئی چپقلش اور ٹیپو کی بڑھتی ہوئی دوستی نے بھی انگریزوں کو دہشت زدہ کر دیا۔ نپولین مصر تک آ گیا اور برطانیہ کے ہندوستانی مقبوضات خطرے میں نظر آنے لگے۔ چناں چہ ۱۷۹۸ء میں سامراج کا ہرکارہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل بن کر برصغیر میں وارد ہو گیا اور آتے ہی اس نے ملک میں تاجِ برطانیہ کے سب سے بڑے اور آخری حریف، ٹیپو سلطان، کی بچی کھچی لیکن مسلسل ترقی کرتی اور مضبوط بنتی ہوئی

ریاست کو ہڑپ کر لینے کی سازش، برطانوی پارلیمنٹ کے منظور شدہ قانون اور اعلان کردہ پالیسی کے بالکل برخلاف، شروع کردی اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک حد تک مرہٹوں اور پورے طور پر نظام کو ایک بار پھر آزادیِ ہند کے آخری چراغ کو بجھا دینے کی خاطر اپنے ساتھ ایک اتحادِ ثلاثہ (TRIPLE ALLIANCE) میں ملا لیا۔ اس کے علاوہ میسور کے اندرونی غداروں کی ایک لمبی صف تیار کر کے اس نے شیرِ میسور کو بے بس کرنے کے لیے مکاریوں کا ایک جال پھیلا دیا۔

برطانوی سامراج کے ساتھ ہندوستان کو غلام بنانے کے خلاف ٹیپو سلطان کے تحت ریاستِ میسور کی چوتھی جنگ بہت جلد ختم ہوگئی اور ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو ریاست کے دارالسلطنت سرنگا پٹم پر انگریزی فوج کا قبضہ اس حال میں ہوا کہ ایک طرف سلطان کے اعلیٰ حکام پر مشتمل برطانوی لشکر کا پانچواں کالم اغیار کا خیر مقدم کر رہا تھا اور دوسری طرف "گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"، کہنے والا مردِ مجاہد آخری سانس تک دغاباز دشمن سے لڑتا ہوا شہید ہو کر اپنے جاں نثاروں کی لاشوں کے درمیان گر پڑا، حالاں کہ اگر وہ چاہتا تو دشمن سے پناہ طلب کر کے اس کے سائے میں زندہ رہ سکتا تھا، لیکن اس کی غیرتِ ایمانی نے اسے گوارا نہ کیا۔ شہادت کے وقت سلطان کی عمر عیسوی اور ہجری حسابوں سے علی الترتیب اڑتالیس ۴۸ یا پچاس ۵۰ سال تھی۔ اس طرح سولہ ۱۶ سال کے سن سے لے کر بتیس ۳۲ سال، یہ مردِ میدان ہندوستان کو غلامی کا طوق

پہنچانے والے برطانوی سامراج کی بڑھتی ہوئی عالمی طاقت سے لڑتا ہی رہا، غدّاریوں، مکّاریوں اور دغابازیوں سے کبھی اس نے ہار نہیں مانی۔ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے شکست اس کا مقدر تھا، لیکن اس نے شکست تسلیم نہیں کی اور اخلاقی طور پر ایک فاتح کی شان سے جان دی۔ اس معنے میں وہ بہ یک وقت شہید بھی تھا، غازی بھی۔ جب تک اس کی موت نہیں ہوئی انگریزوں کو یہ دعویٰ کرنے کی ہمّت نہیں ہوئی کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے"، حالاں کہ ۱۸۵۷ء کے واقع ہونے میں ابھی اٹھاون ۵۸ سال باقی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان ٹیپو کی وفات کے ساتھ ہی آزاد ہندوستان کی رُوح نکل چکی تھی، گرچہ اس کا سڑتا ہوا جسم مزید نصف صدی تک باقی رہا اور انگلستان کے گدھ اسے نوچتے رہے، یہاں تک کہ تقریباً ایک سو سال تک اسے ہضم کرکے بیٹھ گئے۔

زوال کے اسباب

حیدر علی کی قائم کی ہوئی سلطنتِ خداداد توسیع و ترقی کے بعد ریاستِ میسور میں ۱۷۶۱ء سے ۱۷۸۲ء تک نوابِ حیدر علی اور اس وقت سے ۱۷۹۹ء تک ٹیپو سلطان کے تحت اڑتیس ۳۸ سال تک جنوبی ہند سے پورے ہندوستان کو قومی و ملّی غیرت و حمیّت، آزادی و حرّیت اور صلابت و شجاعت کا پیغام دیتی رہی۔ لیکن اس کے خلاف مسلسل اندرونی و بیرونی سازشیں ہوتی رہیں، جن کی تعداد مصنف سلطنتِ خداداد محمود بنگلوری نے ۶۱ تا ۹۶ نو بتائی

ہے۔ سازشوں کے ساتھ سلطنت کے خلاف پیہم جنگیں بھی ہوتی رہیں۔ کرناٹک کے کٹھ پتلی نواب کے علاوہ مرہٹے اور نظام بھی سلطنت خداداد پر فوج کشی میں برطانوی سامراج کی مدد کرتے رہے۔ یہ تینوں سیاسی قوتیں ۱۷۵۷ء کے بعد مغلیہ سلطنت کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر ملک میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتی تھیں اور ان تینوں ہم جُووں کی راہ میں سلطنتِ خدا داد حائل ہوتی نظر آئی، لہٰذا ان میں سے ہر ایک اس کو فنا کرنے کے درپے ہوگیا۔ نظام ایک مسلم حریف کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، مرہٹے ایک نئی اسلامی طاقت کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے، برطانیہ اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل میں سب سے زیادہ مزاحم حیدر علی اور ٹیپو کو ہی سمجھتا تھا۔

اس صورتِ حال میں اگر نظام اور مرہٹوں کو مستقبل کا شعور اور ملّی و ملکی مفاد کا لحاظ ہوتا تو وہ حیدر علی اور ٹیپو کے ساتھ تعاون کرکے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بناتے، لیکن انہوں نے انتہائی نادانی اور مفاد پرستی سے کام لے کر حیدر علی اور ٹیپو ہی کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور انگریزوں کی مکّاریوں کا شکار ہوگئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال، اودھ اور مغلیہ دربار پر اپنی ہوسِ اقتدار کے پنجے پھیلاتی ہوئی مشرقی و شمالی ہند کو اپنے شکنجے میں لے چکی تھی۔ اب اسے صرف مغربی اور جنوبی ہند پر قبضہ کرنا تھا۔ دغا بازیوں کا جو کھیل وہ پہلے کھیل چکی تھی اسی کو جاری رکھتے ہوئے اس نے اوّل تو مغربی و جنوبی ہند کی علاقائی قوتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھا اور ٹکرا دیا، دوسرے

اس نے سلطنتِ خداداد کو اپنا آخری حریف تصور کر کے اس کے عمائدین کو طرح طرح کی ترغیبات سے اپنے سلطان کے خلاف غدّاری پر اُبھارا۔

ٹیپو سلطان سیاستِ وقت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو نظام اور مرہٹوں کی طرح انگریزوں سے مصالحت اور ان کی اطاعت قبول کر کے اپنی ریاست میں کچھ دن اور راج کر سکتا تھا۔ لیکن اوّل تو اس کی ملّی و قومی غیرت وحمیّت کو غیروں کے سائے میں دادِ عیش دینا گوارا نہیں تھا، دوسرے اس کی بصیرت پر عیاں ہو چکا تھا کہ جس مادی سازوسامان اور اسباب وآلات کے ساتھ اغیار ہندوستان میں ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں ان کا مقابلہ ایک زوال پذیر ہندوستانی سماج نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے تو اپنے زیرِ نگیں علاقے کو اخلاقی و مادّی اصلاح و ترقی کے ذریعے ایک نمونے کی فلاحی ریاست بنانے کی کوشش کی، دوسرے اہلِ وطن کو باہمی اتحاد و اتفاق کا پیغام دیا، تیسرے یورپ کی دوسری بڑی طاقت، فرانس، کو برطانیہ کے مقابلے پر لانا چاہا، چوتھے اس نے عالمِ اسلام کو بڑھتے ہوئے فرنگی استعمار کے خلاف دعوتِ جہاد دی۔

لیکن زمانے کی رَو بدل رہی تھی، تاریخ ایک نیا ورق الٹ رہی تھی' اٹھارہویں صدی کا مشرق زوال کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس صدی کے آخر میں تنہا میسور ہندوستان میں غیر ملکی سامراج کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکتا تھا، ملک کا سماج بوسیدہ و فرسودہ ہو چکا تھا، دیسی ریاستیں عقل وہوش سے بیگانہ ہو چکی تھیں، فرانس اور عالمِ اسلام دونوں

اپنے اپنے مسائل سے پریشان تھے ، برطانیہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت
کی حیثیت سے اُبھر رہا تھا۔ ٹیپو کے عمائدینِ سلطنت ۔ میر صادق،
میر غلام علی ، بدرالزماں خاں نائط ، میر معین الدین ، میر قمرالدین ، میر قاسم علی،
پورنیا ۔ نے ہوا کا رُخ دیکھ کر انگریزوں کے ساتھ سودا بازی کرلی اور حد درجہ
منافقت سے کام لے کر اپنے آقا کے ساتھ بدترین نمک حرامی کی ، اسے
حالات سے بے خبر رکھا ، اس کے احکام کی خلاف ورزی کی ، اس کے
مورچے دشمن کے حوالے کر دیے ، اس کی تیاریوں کی اطلاعات دشمن کو فراہم
کیں ، اس کے وفاداروں کو بے بس کیا اور اس کے دارالسلطنت پر حملہ آور
لشکر کی راہ پوری طرح ہموار کر دی ۔

تاریخ کا ایک سوال یہ ہے کہ کیا ٹیپو سلطان جیسا بیدار مغز حکمراں
اتنا غافل تھا کہ اپنے گرد پھیلتے ہوئے جال کی اس کو بالکل خبر نہیں ہوئی
اور وہ غداروں کی ریشہ دوانیوں کا کوئی توڑ نہیں کر سکا ؟ ٹیپو کے ذہن و کردار
کو دیکھتے ہوئے اس سوال کا جواب اثبات میں دینا مشکل ہے ۔ بلا شبہ
وہ اپنے حکام پر اعتماد اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا تھا ، اس کی
رواداری اور مروّت سے عوام و خواص سبھی فائدہ اُٹھاتے تھے ، مگر وہ
اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا تھا ، البتہ اس کی انصاف
پسندی محض شبہے پر کسی کو سزا دینے کے لیے تیار نہیں تھی اور وہ
اپنے رفیقوں کو شکوک کی بنیاد پر رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ یقیناً اسے اپنے
آس پاس سازش کی بو محسوس ہوتی تھی اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کے

گردبغض وعداوت کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے۔ اسے احساس تھا کہ ایک بگڑے ہوئے ماحول اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اس نے جو اقدامات کیے ہیں ان سے خواص کا ایک بااثر طبقہ برہم ہے۔

ان نامساعد حالات کے ساتھ ٹیپو سلطان نے مصالحت کے بجائے مجاہدے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو قربانی کے لیے تیار کرلیا، دوستوں کی بے وفائیوں اور دشمنوں کی تیاریوں سے بے پروا ہوکر اس نے اپنی جان داؤ پر لگادی۔ شاید وہ اپنے اس عمل سے آئندہ نسلوں کو ایک پیغامِ عزیمت دینا چاہتا تھا۔ ہندوستانیوں سے مایوس ہوکر اس نے انگریزوں کے مقابلے پر فرانس اور عالم اسلام سے کمک طلب کی اور جب اس میں بھی اسے ناکامی ہوگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں، عزت کی موت یا ذلت کی زندگی۔ ایسے ہی تاریخی موقع پر اس کا وہ مشہور مقولہ سامنے آیا:

"گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"

لہذا وہ اپنے آپ کو بچانے کے بجائے آخری وقت تک لڑتا رہا اور اس نے موت کو شمشیر بہ کف گلے لگایا:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

(طارق کی دعا۔ اندلس کے میدان جنگ میں: بالِ جبریل۔ اقبالؔ)

سلطنتِ خداداد کا زوال اسی شان سے ہوا اور سرنگا پٹم میں
ٹیپو سلطان کی غازیانہ شہادت نے جریدۂ عالم پر ایک اعلیٰ آفاقی مقصد

سے عشق کا نقشِ دوام ثبت کر دیا۔ یہ عہدِ وسطیٰ سے نکل کر دورِ جدید کے نقطۂ آغاز پر مشرق کی حریت اور مغرب کے سامراجی ارادوں کے مقابلے میں ایشیا کی تابِ مقاومت کا پہلا نقش تھا جو آنے والے ڈیڑھ سو سال تک آزادی کے علم برداروں کو ان کی منزلِ مقصود کا راستہ دکھاتا رہا۔ یہ غلامی کی لعنت قبول کرنے سے رُوحِ ہندوستان کا قطعی انکار تھا۔

ٹیپو سلطان کے کارنامے

ٹیپو سلطان کا سب سے بڑا کارنامہ اٹھارہویں صدی کی ایک چھوٹی سی ریاست میں جاگیرداری کا خاتمہ اور ایک قسم کی جمہوریت کا آغاز تھا۔ پالیگاروں کی زمین داری کے مظالم کو ختم کر کے سلطان نے زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسان بیچ کے دلالوں کو چھوڑ کر براہِ راست سرکار کو لگان دینے لگے اور یہ قانون بنا دیا گیا کہ "جب تک کسان زمین کو آباد رکھے اس کو زمین سے بے دخل نہ کیا جائے اور زمین دواماً اسی کی ملکیت سمجھی جائے۔" (ص ۳۹۹ سلطنتِ خداداد) اس طرح ریاست میں زمین کی ایک نئی تقسیم عمل میں آئی جو کسانوں اور مزدوروں کی خوش حالی کا باعث ہوئی۔ سلطنت کا فرمان تھا کہ "جو شخص بھی زمین آباد کرنے کے لیے درخواست دے اس کو زمین مفت دی جائے اور اس وقت تک اس سے لگان نہ لیا جائے جب تک زمین

میں پیداوار نہ ہو ۔" (ایضاً)

سلطنت کے انتظام میں رعایا کو شریک کرنے کے لیے ٹیپو سلطان نے ایک "مجلسِ وطنی" (پارلیمنٹ) قایم کی جس کا نام "زمرۂ غم نہ باشد" رکھا گیا، مطلب یہ کہ شخصی اقتدار کے بجائے مشاورتی حکومت کے قیام سے باشندگانِ ریاست کے دلوں سے وہ خطرے اور اندیشے دُور ہو گئے جو مطلق العنان بادشاہت یا آمریت سے پیدا ہوتے ہیں اور سلطانِ وقت اب ایک آئینی حکمراں بن گیا جسے کسی دستور اور ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرنی ہے ۔

بحریہ کا قیام بھی سلطان کا ایک زبردست کارنامہ ہے ۔ وہ پہلا ہندوستانی حکمراں تھا جسے سیاستِ وقت میں سمندری راستوں کی نہ صرف اہمیت کا احساس ہوا بلکہ اس نے ان کا باضابطہ انتظام کرنے کی بھی کوشش کی ۔ اس نے ہندوستان کے ساحلوں کی حفاظت کے لیے بحرِ ہند میں بصرہ، بوشہر، عمان اور عدن کی بندرگاہوں کی نگرانی ضروری سمجھی ۔ سلطان کی بحری فوج میں گیارہ میرِ یم (لارڈ آف ایڈمیرلٹی) اور تیس امیر البحر تھے، جن میں دس ساحل پر اور بیس جہازوں پر رہتے تھے" (صفحہ ۴۴ سلطنتِ خداداد) ۔ ملّاحوں یعنی بحری جہازوں کے عملے (CREW) کی تعداد دس ہزار، پانچ سو بیس تھی ۔ ۱۷۹۴ء میں ایک سو جنگی جہازوں کی تیاری کا حکم دیا گیا تھا ۔ پورا جہاز اپنے تمام کل پرزوں کے ساتھ ریاست کے اندر ہی بنایا جاتا تھا ۔

صنعت و حرفت اور معدنیات کے دائروں میں سلطنتِ خداداد کے کمالات کی جو فہرست محمود بنگلوری نے دی ہے وہ حسبِ ذیل ہے :

"مٹّی کی مصنوعات، لکڑی کا کام، چرم سازی، تیل اور تیل کی دیگر مصنوعات، صندل، رسّی اور قالین، ہاتھی دانت کا کام، نمک بنانا، زر، کاغذ پر سونے کا رنگ چڑھانا، اون، فنونِ لطیفہ، ریشم، روئی کی مصنوعات، لوہے کی مصنوعات، سلطنت خداداد کے سکّے، محکمۂ تعمیرات۔"

ان سیاسی، معاشی، فوجی اور انتظامی اصلاحات کے علاوہ ٹیپو سلطان نے مذہبی و اخلاقی اصلاحات بھی کیں۔ اس نے مسلم سماج میں تیزی سے پھیلتی ہوئی ان تمام بدعات اور ان کے اسرافات پر پابندی لگا دی جو احمد آباد، گول کنڈہ اور بیجا پور کی ریاستوں نے فروغ دیے تھے۔ تعزیہ داری کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کے دھندے پر بھی سلطان کے امتناعی احکام کی زد پڑی۔ منشیات ممنوع قرار دی گئیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں شرعی عدالتیں قائم کی گئیں۔ ذات پات کے نسلی تفاخر پر ضرب لگائی گئی۔ جمعہ کے خطبوں کی اہمیت پر زور دے کر انہیں عوام کے لیے مفید بنایا گیا۔ اس مقصد کے لیے مسنون عربی خطبات کے علاوہ انہی کا ایک حصہ بنا کر عام نمازیوں کی سمجھ میں آنے والی زبان، مثلاً اس وقت فارسی، میں منبر سے خطاب کو رواج دیا گیا اور لوگوں کے دینی شعور کی تربیت، احکامِ شریعت سے آگاہی اور اخلاقی اصلاح کے لیے نئے خطبات مرتب

کر کے شائع کیے گئے ۔ ایک کتاب "فتح المجاہدین" (یا تحفۃ المجاہدین) سلطان کی زیرِ نگرانی تصنیف ہو کر اس کی ہزار ہا نقلیں ریاست میں تقسیم کی گئیں۔ بہ قول مصنف سلطنتِ خداداد "اس کتاب کا پہلا باب مسائل عقائد و نماز و جہاد و ترکہ وغیرہ پر مشتمل تھا۔" (ص ۴۰۵)

سلطان نے اپنی قلمرو میں ہر قسم کی بدعنوانی، بدکاری، رشوت ستانی اور چوری وغیرہ جیسے جرائم کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک وسیع و موثر عدالتی نظام قائم کیا۔ یہ نظام عدل و مساوات کے جن بے خطا اصولوں پر مبنی تھا، اس کا ایک نقشہ مصنف سلطنتِ خداداد نے اس طرح کھینچا ہے :

"ہر شہر اور ہر قریہ میں ایک پنچایت مقرر تھی ۔ قدیم دستور کے مطابق ہر گاؤں میں پٹیل معمولی تنازعات کا پنچایت کی رائے سے فیصلہ کر دیتا تھا۔ تعلقوں اور ضلعوں میں عامل اور آصف فیصلہ کرتے تھے ۔ اگر فریقین مقدمہ کو اس فیصلہ سے تشفی نہ ہوتی تو مقدمہ صدر عدالت تک اور اس کے بعد سلطان تک پہنچایا جاتا تھا ۔ صدر عدالت میں دو حاکم رہتے تھے ۔ ایک مسلمان اور ایک ہندو ۔

مسلمانوں کے شرعی مقدمات کے لیے ہر شہر میں قاضی مقرر تھے اور یہ بھی پنچایت کے ذریعہ ہی فیصلہ کرتے تھے۔ شرعی مقدمات بھی صدر عدالت تک پہنچائے جاتے تھے۔ خاص

ہندوؤں کے مقدمات کا شاستروں کی رُو سے پنڈت فیصلہ کرتے تھے۔" (صفحہ ۴۳)

یہ صحیح اور پورے معنوں میں ایک غیر فرقہ وارانہ نظام تھا، جس میں مذہبی رواداری یا غیر جانب داری کا تصور عصرِ حاضر کے مروّجہ سیکولرزم سے زیادہ مبنی بر انصاف اور وسیع النظری پر مشتمل تھا۔ یہ دراصل اسلامی رواداری کا ایک نمونہ تھا، جس میں عوام و خواص کی صلاح و فلاح کے لیے انسانی قدروں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اس نظامِ عدل کا اثر یہ ہوا کہ سلطنتِ خداداد تقریباً جرائم سے پاک ہوگئی اور بہت کم مقدمات عدالت کے سامنے آنے لگے۔ ٹیپو سلطان کی حکومت درحقیقت ایک فلاحی ریاست تھی اور ٹیپو ایک سلطانِ عادل تھا یعنی اسلامی طرزِ حکومت کا ایک مثالی نمونہ۔

تاریخ میں ٹیپو کا مقام

سلطان ابوالفتح علی ٹیپو شہیدؒ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا پہلا ہیرو تھا۔ جس اٹھارہویں صدی کے شروع میں آخری عظیم مغل بادشاہ اورنگ زیبؒ کی وفات ہوئی اس کے خاتمے پر اپنے سترہ سالہ دورِ حکومت میں، نواب حیدر علی کے ۲۲ سالہ دورِ اقتدار کے بعد، ۱۷۸۲ء سے ۱۷۹۹ء تک سلطان شہید نے اپنی زندگی اور موت دونوں کے انداز و ادا سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نہ صرف شیرِ میسور بلکہ شیرِ ہند اور شیرِ مشرق تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ شجاعت و فراست کے لحاظ سے ٹیپو، نپولین اور صلاح الدین ایوبیؒ کے پائے کا انسان تھا۔ اسے بلاشبہ تاریخِ انسانیت کا ایک بطلِ جلیل کہا جا سکتا ہے۔ علمی قابلیت، سیاسی بصیرت، انتظامی اہلیت، جنگی صلاحیت اور فاتحانہ جرأت اس کی عظمت کے نشانات ہیں۔ اس کی اولوالعزمی، دُور بینی اور عدل گستری اسے تاریخِ عالم کی زندۂ جاوید شخصیتوں میں شامل کرتی ہے۔

'AN ADVANCED HISTORY OF INDIA' کے مصنفین آر، سی، مجومدار، ایچ، سی، رائے چودھری اور کالی کنکر دت ٹیپو سلطان کے تاریخی کردار کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں:

"ایک صالح اخلاقی کردار کا انسان، اپنے طبقہ کی مروّجہ برائیوں سے پاک، وہ خدا پر قوی ایمان رکھتا تھا۔ وہ بہت ہی تعلیم یافتہ تھا، فارسی، کنڑ، اُردو روانی سے بولتا تھا اور ایک بیش قیمت کتب خانے کا مالک تھا۔ ایک بہادر سپاہی اور ایک ہوشیار کمان دار کے ساتھ ساتھ ٹیپو ایک اعلیٰ درجے کا سیاست کار بھی تھا۔ اس کا ثبوت اس کا یہ واضح تصور تھا کہ کسی ہندوستانی حکمراں کے بجائے انگلستان ہی اصل دشمن تھا۔ اس کے علاوہ سیاسیات میں اسے فرانس اور انگلستان کے باہمی تعلقات کا ادراک تھا، اسی لیے اس نے اپنے سفیر فرانس اور دوسری جگہوں میں بھیجے، اس نے کابل کے زماں شاہ

کے ساتھ بھی مراسلت کی ۔ اس نے ملک کی آزادی کو ہر دوسری چیز سے بلند تر سمجھا اور اس کی حفاظت کی کوشش کرتے ہوئے جان دے دی ۔ اپنے بہتیرے ہم عصر ہندوستانی حکمرانوں کے برخلاف ٹیپو ایک قابل اور محنتی فرماں روا تھا۔ ایڈورڈ مور اور میجر ڈیروم جیسے اس کے متعدد انگریز معاصرین بھی اس کے حسنِ انتظام سے متاثر تھے اور انہوں نے بلا تامل اقرار کیا ہے کہ ٹیپو اپنی قلمرو میں کافی مقبول تھا۔ سر جان شور تک کا بیان ہے کہ "ٹیپو کی سلطنت میں کسان محفوظ ہیں اور ان کی محنت کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ انہیں اس کا انعام بھی دیا جاتا ہے ۔" کچھ نئے پرانے لکھنے والوں نے غلط طور پر ٹیپو کو ایک بے رحم ، خوں آشام ظالم ، ستم شعار آمر اور شدید جنونی قرار دیا ہے ...... وہ کوئی شدت پسند متعصب بھی نہیں تھا۔ ٹیپو کے لکھے ہوئے شرنگیری خطوط کی دریافت اور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "وہ ہندو رائے عامہ کو ہموار کرنا جانتا تھا اور مذہبی نارواداری اس کی تباہی کا سبب نہیں تھا۔ گرچہ وہ ایک متقی مسلمان تھا ، مگر اس نے اپنی ہندو رعایا کا مذہب تبدیل کرنے کی کوئی اجتماعی کوشش نہیں کی ، جیسا کہ ولکس کے بیان نے غلط طور پر یقین دلانے کی کوشش کی ہے ۔"

(ص ۷۰۸-۷۰۷ چوتھا اڈیشن، ۱۹۷۸ء، میکملن انڈیا لمیٹیڈ، مدراس)

☆

'A NEW BOOK ON MODERN INDIA' کے مصنفین،

بی، ال گروور اور ایس گروور کہتے ہیں:

"جدّت اور اصلاح کے جذبے نے ٹیپو کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے باپ سے ورثے میں پائے ہوئے نظامِ حکومت میں متعدد تبدیلیاں کرے۔ ایچ، ایچ ڈوڈ ویل نے ٹیپو کی تعریف کی ہے کہ وہ پہلا ہندوستانی فرماں روا تھا جس نے اپنے انتظامِ حکومت میں مغربی طریقوں کا استعمال کرنے کی سعی کی۔ ہر محکمہ ایک سربراہ کے تحت رکھا گیا جس کی مدد کے لیے متعدد ماتحت حکام ہوا کرتے تھے اور یہ سب مل کر ایک بورڈ کی تشکیل کرتے تھے۔ محکمے میں فیصلے پوری بحث کے بعد کیے جاتے تھے، جس میں ارکان مجلس کو اختلافِ رائے کا حق بھی تھا۔ یہ فیصلے کثرتِ رائے سے کیے جاتے تھے اور جلسوں کی کارروائیاں مُرتب کی جاتی تھیں۔ بہر کیف تمام اہم امور میں آخری فیصلہ سلطان کا ہوتا تھا۔" (ص ۱۵۰ دسواں ایڈیشن، ۱۹۹۰ء، ایس چاند اینڈ کمپنی، نئی دہلی)

"ٹیپو بہادر اور جری تھا۔ اس نے ویلزلی کے ماتحت اتحاد (SUBSIDIARY ALLIANCE) کی پیش کش ٹھکرا کر عزّتِ نفس

کا ثبوت دیا۔ اس نے مغربی سامراج کے بینڈ ویگن پر ایک مطیع فرمان ہستی بن کر رہنے کے بجائے ایک ہیرو کی طرح جان دینے کو ترجیح دی۔ اس کی انتہائی بد قسمتی یہ تھی کہ اس کا مقابلہ ایسے سامراجی دیووں سے تھا جو پورے ہندوستان کو مسمار کر دینے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے اور ارادہ بھی۔ ٹیپو کی زندگی اور اس کی جرأتیں آج کے ہندوستانی ذہن کو دوسرے کثیر ہندوستانی شہزادوں سے زیادہ ولولہ بخشتی ہیں۔"

(ص ۱۵۴ ایضاً)

MODERN INDIAN HISTORY کا مصنف وی، ڈی، مہاجن رقم طراز ہے:

"یہ کہنا غلط ہے کہ ٹیپو کوئی وحشی اور بے رحم جنونی تھا۔ وہ ایک محنتی حکمراں تھا جو انتظامیہ کی ہر شاخ کی نگرانی خود ہی کرتا تھا۔ اس کی فطرت میں سنگ دلی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے دشمنوں پر کوئی رحم نہیں کرتا تھا اور وہ انگریزوں سے اپنے دل کی گہرائیوں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آمادہ نہیں کر سکا۔ وہ برطانیہ کے ساتھ اپنی پوری طاقت سے لڑا اور لڑتے ہوئے ہی مرگیا، لیکن اہلِ برطانیہ کے ساتھ کسی مصالحت کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ وہ فرانس کی طرف

مائل تھا اور زندگی بھر فرانسیسیوں کو ترجیح دیتا رہا۔"

(ص۸۸ سولہواں ایڈیشن، ۱۹۸۸ء، ایس چاند اینڈ کمپنی، نئی دہلی)

ٹیپو سلطان کی عادلانہ حکومت اور فلاحی ریاست کے کارناموں کے اعتراف پر مبنی "سلطنتِ خداداد" کے حسبِ ذیل اقتباسات بھی ہیں، جو غیر ملکیوں اور دشمنوں کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں:

"کیپٹن لٹل جو میسور کی تیسری جنگ میں (ایک انگریز افسر کی حیثیت سے) نمایاں حصہ لے چکا تھا اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے ــــــ

ٹیپو کے متعلق بہت سی افواہیں سُنی جاتی ہیں کہ وہ ایک جابر و ظالم حکمراں ہے، جس کی وجہ سے اس کی تمام رعایا بیزار ہے۔ لیکن جب ہم اس کے ملک میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ صنعت و حرفت کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے نئے نئے شہر آباد ہوئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ رعایا اپنے اپنے کاموں میں مصروف و منہمک ہے۔ زمین کا کوئی حصّہ بھی بنجر نظر نہیں آیا۔ قابلِ کاشت زمین جس قدر بھی مل سکتی ہے۔ اس پر کھیتیاں لہرا رہی ہیں، ایک انچ زمین بھی بے کار نہیں۔ رعایا اور فوج کے دل میں بادشاہ کا احترام اور محبت اتم درجہ موجود ہے۔ فوج کی تنظیم اور اس کے ہتھیاروں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ یورپ کے کسی مہذب ملک کی فوج سے کسی حالت میں بھی پیچھے نہیں ہے۔

مورخ سنکلیر اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے ــــ

جس وقت انگریزی فوجیں ٹیپو کے ملک میں داخل ہوئیں تو دیکھا گیا کہ تمام رعیت ، ہندو اور مسلمان ، نہایت خوش حال ہے ۔ تمام ملک سرسبز ہے ۔ زراعت اچھی ہو رہی ہے ۔ کل رعیت سلطان کے نام پر فدا ہے ۔ جس وقت انگریزی فوج سرنگا پٹم میں داخل ہوئی تو وہاں کے لوگوں نے اپنی دولت انگریزوں کے سامنے لا کر رکھ دی کہ وہ سلطنت کو ٹیپو کے خاندان میں چھوڑ کر چلے جائیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی ہر دلعزیز تھا ۔ (ص ۲-۱-۱۰۴)

الفضلُ ما شہدت بہ الاعداءُ (فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں) ۔ واقعہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں ٹیپو سلطان کے حریف انگریزوں نے اس کی حکومت اور مقبولیت کے متعلق جو بیانات دیے ہیں وہ نہ صرف اس کے خلاف تمام متعصبانہ الزامات کی تردید کے لیے کافی ہیں بلکہ اس کی عظمت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ رعایا ، بلا امتیازِ طبقہ و فرقہ اس کی موت کے بعد بھی اس کے ورثا ہی کو تختِ سلطنت پر اس کا جانشین بنانا چاہتی تھی اور اپنی اس آرزو کا اظہار عوام نے اس خطرناک حالت میں کیا جب ٹیپو کی فوج کو شکست دینے والی فوج اس کی سلطنت پر قابض ہو کر اسے تاراج کر رہی تھی ۔ جنگ کے نازک موقعے پر جب نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے ایک مقتول

بادشاہ کے ساتھ اس کی رعایا کی ایسی زبردست عقیدت و محبت کا اظہار تاریخِ عالم کا ایک نادر واقعہ ہے۔ یہ ایک سلطان کے کردار کی وہ عظمت ہے جس پر عصرِ حاضر کا بڑے سے بڑا صدرِ جمہوریہ یا وزیرِاعظم رشک کرسکتا ہے۔ درحقیقت ٹیپو کی سلطنت مغربی انداز کی عوامی جمہوریت سے بھی بہت آگے بڑھ کر اسلامی نظریۂ شورائیت اور تصورِ خلافت کی آیئنہ دار تھی اور صحیح معنی میں وہ فلاحی ریاست تھی جو خدا پرستی اور خدا ترسی کے فلسفۂ عدل پر مبنی ہے۔

انہی حقایق کی روشنی میں علامہ اقبالؔ نے اپنی سب سے اہم تخلیق "جاوید نامہ" کے آخری باب "آں سوے افلاک" میں دیگر "سلاطینِ مشرق" کے ساتھ "سلطان شہید" کو زبردست خراجِ عقیدت ان ولولہ انگیز اور بصیرت افروز الفاظ میں پیش کیا ہے:

آں شہیدانِ محبت را امام — آبروے ہند و چین و روم و شام

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر — خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر!

عشق رازے بود بر صحرا نہاد — تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد؟

از نگاہِ خواجۂ بدر و حُنین — فقرِ سلطان وارثِ جذبِ حسین

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز

(شہیدانِ محبت کا وہ امام ہند و چین کی آبرو ہے۔ اس کا نام آفتاب و ماہتاب سے زیادہ روشن ہے، اس کی قبر کی خاک مجھ سے اور تجھ سے

زیادہ زندہ ہے۔ عشق ایک راز تھا جسے اس نے میدانِ عمل میں فاش کیا، تجھے معلوم نہیں کہ اس نے جان کس شوق سے دی؟ خواجۂ بدر و حُنین صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کے فیض سے سلطان کے فقر میں حضرت امام حسین رضؓ کا جذبۂ دل تھا۔ سلطان تو اِس چند روزہ مسافر خانے سے چلا گیا، مگر دکن میں اس کا نقارہ آج تک بج رہا ہے)۔

ان اشعار میں حسب ذیل نکات پر زور دیا گیا ہے:

۱۔ سلطان ٹیپو شہیدؒ عشقِ الٰہی کی راہ میں جان دینے والوں کے درمیان ایک نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

۲۔ ہندوستان، چین، ترکی اور شام وغیرہ ممالکِ مشرق کے لیے ان کی ہستی باعثِ فخر ہے۔

۳۔ ان کا عشق میدانِ عمل میں بروے اظہار آیا۔ اس کارنامے سے عشق کی حقیقت آشکار ہوئی۔ چنانچہ ان کی موت ایک عالمِ شوق میں واقع ہوئی۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے سلطان کے فقرِ غیور میں وہی جذبۂ شہادت پیدا ہو گیا، جو حضرت امام حسینؓ کے کردار میں موجزن تھا۔

۵۔ گرچہ سلطان کی وفات پر ایک طویل مدّت گزر گئی، مگر اس کا شہرہ اور چرچا باقی ہے۔

یہ سب نکتے ایک مشہور شعر کی ترجمانی کرتے ہیں:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(وہ شخص کبھی نہیں مرتا جس کے دل میں عشق کی زندگی پیدا ہوگئی، بساطِ عالم پر عاشقوں کی حیاتِ جاوید کی مہر ثبت ہے)

اقبالؔ کے خیال میں خدا و رسول ؐ کی محبت نے ٹیپو سلطان کی سیرت میں اسلامی فقر کی وہ شان پیدا کردی تھی جو معرکۂ کرب و بلا میں ایثار و قربانی کی مثالیں قائم کرتی ہے اور دنیا کے بجائے آخرت کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر زندگیِ جاوید کا سامان کرتی ہے۔ خواجۂ بدر و حنین ؐ کے فیض سے جذبِ حسین رضؓ کا یہی وہ مثالی انداز تھا جس نے اٹھارھویں صدی کے خاتمے پر ٹیپو کے دار السلطنت، سرنگا پٹم، کو ایک میدانِ کربلا بنا دیا تھا۔ برطانوی لشکرِ جرار نے بے شک ٹیپو کو قتل کردیا، مگر راہِ حق کے اس شہید کے خونِ ناحق نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قیام سے پہلے ہی اس کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں اور بہت جلد یہ خون اس طرح رنگ لایا کہ بالآخر نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا و افریقہ پر برطانیہ کا سورج غروب ہوگیا۔ خیر و شر کی کشمکش پر مبنی تاریخِ انسانیت کا یہ مطالعہ اقبالؔ کا پسندیدہ موضوع ہے، جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ٹیپو کے متعلق جاوید نامہ کے جن اشعار کا حوالہ پہلے دیا گیا ان کے بعد اقبالؔ نے سلطان شہید رحؒ کے سلسلے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ مزید خیالات

کا اظہار کیا ہے ۔ انہوں نے "پیغامِ سلطان شہید بہ رودِ کاویری" کا اندراج بھی "(حقیقتِ حیات و مرگ و شہادت)" کے قوسین کے ساتھ کیا ہے ۔ یہ ایک قدرے طویل نظم ہے جس کے پہلے بند کے آخر میں سُلطان کا تعارف یا اس کی تعریف اس شعر پر ختم ہوتی ہے :

آں کہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب واو بیدار بود

(سلطان وہ ہے جس کی گفتار بھی سراپا کردار تھی اور وہ اس وقت بیدار تھا جب پُورا مشرق محوِ خواب تھا) اس کے بعد رودِ کاویری کو سلطان ٹیپو نے حیات و موت اور شہادت کے متعلق جو پیام دیا ہے اس کے جستہ جستہ چند نکات یہ ہیں :

زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات　　　　از خدا کم خواستم طولِ حیات

(چوں کہ زندگی کا ثبات اس کے وصف میں تھا ، لہذا خدا سے میں نے اس کی زیادہ مقدار نہیں مانگی)

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟　　　　یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش!

(زندگی کی رسم اور اس کا مذہب و مسلک کیا ہے ؟ شیر کا ایک لمحہ بھیڑ کے سو سال سے بہتر ہے)

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست　　　　موت نیرنج و طلسم و سیمیاست

(زندگی خدا کے احکام کو ماننے اور اس کی مشیت پر راضی رہنے کا نام ہے ، جب کہ موت ایک تماشا ، طلسم اور فریب ہے)

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

(بندۂ حق شیر ہے اور موت اس کا شکار، موت تو اس بندے کے سَو مقامات میں سے محض ایک مقام ہے)

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ زندگی اورا حرام از بیم مرگ

(غلام موت کے ڈر سے ہر لمحہ مرتا رہتا ہے، اور یہ خوف اس کی زندگی حرام کر دیتا ہے)

بندۂ آزاد را شانے دگر مرگ اورا می دہد جانے دگر

(آزاد انسان کی شان کچھ اور ہوتی ہے، موت سے اس کو نئی زندگی ملتی ہے)

اُو خود اندیش است مرگ اندیش نیست مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

(آزاد انسان موت کے بجائے اپنی ہستی کی فکر کرتا ہے، موت تو آزاد انسانوں کو صرف ایک لمحے کے لیے لاحق ہوتی ہے)

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک آں دگر مرگے کہ برگیرد زخاک

(مردِ مومن خدا سے ایک ایسی موت کی دُعا کرتا ہے جو اسے خاک سے اُوپر اٹھا دے)

آں دگر مرگ انتہاے راہِ شوق آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

(ایسی موت راہِ شوق کی انتہا ہوتی ہے اور جنگاہِ شوق کی آخری تکبیر)

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است

(دنیوی بادشاہوں کی جنگ تو غارتگری ہے، لیکن مومن کی جنگ ایک سنّت رسولؐ ہے

جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست! ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

(مومن کی جنگ کیا ہے؟ دوست کی طرف ہجرت! دنیا کے بجائے کوئے دوست کا اختیار)۔

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت

(وہ رسولِ خدا جس نے دنیا کی قوموں کو رازِ محبت بتایا جنگ کو اسلام میں رہبانیت سے تعبیر کیا)۔

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

(شہید کے سوا کوئی اس نکتے کو سمجھ نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ نکتہ اسی نے جان دے کر حاصل کیا ہے)۔

اِس طرح اقبال نے سلطان ٹیپو شہید کی زبان سے اِسلام کے پورے فلسفۂ جہاد کی ترجمانی کرائی ہے اور دنیا و آخرت کے موازنے سے حیات اور شہادتِ حق کے باہمی تعلق کو اچھی طرح واضح کرایا ہے۔ ٹیپو کے بیانات میں جو ولولہ ہے وہ اس کے جوشِ جہاد کی ایک تصویر ہے۔ بلاشبہ ٹیپو ایک عظیم محبِ وطن تھا، مدبّر تھا، منتظم تھا اور انگریزوں کے ساتھ اس کی لڑائیاں حرّیت اور آزادی کے تحفظ کے لیے تھیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے اہلِ وطن کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دی، اس کے عدل و انصاف اور تصورِ مساوات نے بلا امتیازِ فرقہ و طبقہ عوام کے دل جیت لیے، اس کی ریاست کی مادّی ترقیات نے عام خوش حالی کا سامان کیا، اس کے

فلاحی منصوبے اس کی روشن خیالی پر دلالت کرتے ہیں، لیکن یہ سارے کمالات ایک جذبۂ جہاد پر مبنی تھے اور ٹیپو کی اولوالعزم مجاہدانہ سرگرمیوں کے مظاہر تھے، ورنہ ایک دنیا دار حکمراں حالات کو دیکھتے ہوئے بہ خوشی نظام اور مرہٹوں کی طرح انگریزوں سے مصالحت کرکے ان کے زیرِ سایہ دادِ عیش دینا پسند کرتا، جب کہ سلطان شہید کی پوری زندگی اس کے برخلاف ایک مسلسل اور مستقل مجاہدہ و معرکہ تھی۔

ٹیپو سُلطان اور ہندوستان کا مستقبل

ٹیپو سلطان اپنے عہد کا جدید ترین، روشن خیال اور صحیح معنوں میں ترقی پسند حکمراں تھا۔ وہ اس دور کا انسان تھا جب ہندوستان کا عہدِ وسطیٰ ختم ہو رہا تھا اور انگلستان کا دورِ جدید شروع ہوئے ایک مدّت گزر چکی تھی۔ لیکن ٹیپو کی جدّتیں، خدمتیں، فضیلتیں اور عظمتیں صرف اپنے وقت کے لیے نہیں تھیں، آنے والے زمانوں کے لیے بھی تھیں۔ وہ یقیناً اپنے وقت سے آگے، بہت آگے تھا۔ ملک کو غلامی سے بچانے کے لیے اس نے جہادِ آزادی کا جو راستہ دکھایا اور اس کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ کی جدّوجہد کی، فروغِ معیشت کی تدبیریں کیں اور انقلاب سیاست یعنی شاہانہ مطلق العنانی کے بجائے جمہوری شورائیت کی ابتدا کی، ان سب کاوشوں کا اثر ملک کی آئندہ نسلوں پر پڑا۔

شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

نے ملک وملّت کی اصلاح و تجدید اور تقویت و ترقی کے لیے سماج کو
کو بدعات و انحرافات سے پاک کر کے اجتہاد و جہاد پر زور دیا۔ شاہ
صاحب کے افکار و خیالات کا چرچا اور اثر پورے ملک میں ہوا اور
بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ٹیپو سلطان نے ریاستِ میسور میں
معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کی اصلاح و تجدید کا جو آغاز کیا
اس میں شاہ صاحب کی صدائے انقلاب کی گونج تھی اور سچی بات یہ
ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں اگر کسی ریاست نے شاہ ولی اللہؒ
کے منصوبوں پر کسی نہ کسی حد تک عمل شروع کیا تو وہ سلطنتِ خداداد ہی تھی۔
چنانچہ ٹیپو سلطان نے بہت ہی مخالف حالات میں حرّیت و مساوات کے
جس عزم کا اظہار اپنے فکر و عمل سے کیا وہ ایک تصوّرِ اجتہاد اور جذبۂ جہاد
ہی پر مبنی تھا۔

جس وقت ٹیپو ملک کی ایک جنوبی ریاست میں پوری اولوالعزمی کے
ساتھ انگریزوں سے نبرد آزما تھا اسی وقت ۱۷۸۶ء میں شمالی ہند کے
قلب میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت اور شاہ ولی اللہ کے
مسلک پر تربیت ہوئی۔ انہوں نے اصلاح و جہاد کرتے ہوئے ۱۸۳۱ء میں
میں جامِ شہادت نوش کیا، لیکن ان کی تحریکِ جہاد جاری رہی اور وہ اتنی
بڑھی کہ برطانوی سامراج نے اسے اپنے لیے ایک خطرۂ عظیم تصور کیا۔ یہ
تحریکِ مجاہدین تھی، جس کا پیش رو اپنی حدود میں ٹیپو سلطان تھا۔ واقعہ یہ
ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ٹیپو نے سامراج سے جنگ کی جو

شمع جلائی تھی وہ انیسویں صدی کے پورے ہندوستان کو روشن کرتی رہی اور اس روشنی کو سب سے زیادہ تحریکِ مجاہدین ہی نے پھیلایا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے بغاوت کا ابھار اسی روشنی میں ہوا، جو دلّی میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہا۔ سرسیّد اور شبلی رحمۃ اللہ علیہما سے اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمہما اللہ تک اصلاح و تجدید اور اجتہاد و جہاد کی ساری کوششیں اس روشنی میں ہی جاری رہیں۔ برِصغیر کی تحریکِ آزادی کے اواخر میں اور آزادی کے بعد بھی یہ روشنی ختم نہیں ہوئی اور اس کی کرنیں آج بھی اندھیروں سے لڑ رہی ہیں۔

بنگال کے حاجی شریعۃ اللہ (مولود ۱۷۶۴ء) ٹیپو سلطان کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے معاشرتی اصلاح کی فرائضی تحریک ۱۸۰۲ء میں شروع کی۔ ان کے صاحب زادے اور جانشین، مولوی محمد مسلم عرف دودو میاں (۱۸۱۹-۶۰ء) نے تحریک کو مزید منظم کیا۔ یہ تحریک ۱۸۲۷ء میں میر نثار علی عرف ٹیٹو کے زیرِ قیادت تحریکِ مجاہدین میں ضم ہوگئی اور اس نے بنگال میں انگریزوں کے بندوبستِ دوامی سے پیدا ہونے والی زمین داری کے خلاف ہندوستان میں کسانوں کی بغاوت کی پہلی تحریک چلائی، جب کہ ٹیپو سلطان ایک چوتھائی صدی پیشتر ریاستِ میسور میں زرعی اصلاحات اور زمینداری کا خاتمہ کرکے زمین کسانوں کے درمیان تقسیم کر چکا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بنگال میں دودو میاں عرف ٹیٹو میر نے بہ یک وقت مذہبی و معاشی دونوں قسم کی اصلاح اور سیاستِ وقت میں عوامی حقوق کے تحفظ کے لیے جو

تحریک پھلائی اس پر ملک کے دوسرے گوشے میں کی گئی ٹیپو سلطان کی اصلاحی و انقلابی کوششوں کا کوئی اثر نہیں تھا؟ کم از کم ٹیپو، ٹیٹو میر کا پیش رو تھا۔ بلاشبہ برطانوی سامراج نے جس طرح ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی سلطنت کا خاتمہ کردیا اسی طرح ۱۸۳۱ء میں ٹیٹو میر کی بغاوت بھی کچل دی، مگر جو کاوشیں ان دونوں نے اپنے طور پر کیں ان کے آثار فنا نہیں ہوئے۔ محروموں اور مظلوموں کی حمایت میں ظلم و ستم کے خلاف عدل و انصاف کا علم سرنگوں نہیں ہوا۔

زمانۂ حال اور مستقبل کے ہندوستان کے لیے ٹیپو سلطان کی ریاست و قیادت نے جو سبق چھوڑا ہے اس کے خاص خاص نکات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ملک ہندوستان اور ملّتِ اسلامیہ کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔

۲۔ فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق قومی تحفظ و ترقی کے لیے ضروری ہے۔

۳۔ پس ماندہ طبقات کی پیش قدمی کا سامان کر کے انسانی مساوات کا قیام ایک فریضہ ہے۔

۴۔ امیر و غریب کا تفرقہ ختم کر کے عام اخوت کا اہتمام زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔

۵۔ حریّت اور آزادی ہر فرد، جماعت اور ملک و قوم کا بنیادی حق ہے، جب کہ غلامی اور استحصال ایک لعنت ہے۔

۶۔ ریاست اور معاشرے کی ہمہ جہتی ترقی کی کوشش حکومتِ وقت

کا فرض ہے۔ دین اور دُنیا کی ہم آہنگی کے بغیر یہ فرض ادا نہیں ہو سکتا۔

۷۔ حکمراں کے کردار کی استقامت ہی اس کی مقبولیت و عظمت کی ضامن ہو سکتی ہے۔

۸۔ زندگی اور موت دونوں کی کامیابی شہادتِ حق پر مبنی ہے۔ یہ شہادت اخلاقی و مادی توازن سے ہی ادا ہو سکتی ہے۔

۹۔ سامراج اور استبداد کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ عوامی صلاح و فلاح ترقی کا سب سے بڑا نشان ہے۔

ضرورت ہے کہ ۱۷۰۷ء سے آج تک کے برِ صغیر کی ایک نئی، حقیقت پسندانہ اور منصفانہ تاریخ مرتب کی جائے، جس میں واضح کیا جائے کہ تین صدیوں کے اندر انسانی نقطۂ نظر سے اور مسلّمہ آفاقی اقدار کے مطابق کن شخصیتوں اور جماعتوں نے کیا کمالات دکھائے اور کارنامے انجام دیے۔ اس سلسلے میں مغربی مورخوں اور ان کے ذہنی غلاموں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر کے اصل حقائق واضح کرنے ہوں گے، اس لیے کہ انگریزوں نے علم و تحقیق کے نام پر پوری دنیا کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تاریخ و تہذیب کو بھی بالکل مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ تاریخ کا یہ بصیرت مندانہ احتساب ہی زندگی کے ان اصولوں کو روشنی میں لائے گا جنہیں رائج الوقت مغربی تمدن نے گہری تاریکیوں میں دفن کر دیا ہے۔ تواریخِ عالم کا یہ واقعہ ایک مفہوم رکھتا ہے کہ وہی عہدِ وسطیٰ جو مشرق میں روشنی کا دور تھا اور اس کے اُجالوں نے مغرب کے اندھیروں کو دُور کیا اسے مغربی

مورخین دَورِ ظلمت قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ اس وقت پورا یُورپ ایک ظلمت کدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کی تفریق و تقسیم مشرق میں کچھ ہے اور مغرب میں کچھ اور، جب کہ دونوں کے درمیان عہدِ وسطیٰ کا تصور بھی مختلف ہے۔ ہندوستان کے اسلامی عہد کو اہلِ مغرب عہدِ وسطیٰ کہتے ہیں، جب کہ سولھویں صدی میں جب مغلیہ سلطنت کو عروج ہو رہا تھا تو انگلستان میں عہدِ جدید شروع ہو چکا تھا۔ اکبر اور ایلزبتھ کا زمانہ ایک ہے۔ یہی ایک نکتہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مغربی مورخین و مستشرقین نے مشرقی تاریخ و تہذیب کو حد درجہ مسخ کیا ہے۔ لہٰذا تاریخ کی نئی تعبیر اشد ضروری ہے۔ یہی تعبیر ٹیپو سُلطان کا صحیح مقام متعین کرے گی، جس کی طرف ایک واضح اشارہ جاوید نامہ میں اقبالؔ نے کیا ہے۔ مستقبل کے ہندوستان کو ماضی کے ٹیپو سلطان کے کمالات و خدمات سے ایک روشنی اور رہ نمائی ملے گی۔ تب ہی سُلطان شہیدؒ کی عظمت کا مکمل اعتراف ہو گا۔ اس اعتراف سے آشکار ہو گا کہ دین و دنیا کی ہم آہنگی کے اسلامی تصوّر کا جو عملی نمونہ سلطنتِ خداداد نے اپنی حدود میں پیش کیا وہ دراصل ماضی سے زیادہ مستقبل کے ہندوستان کا ایک خواب تھا جو ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے۔

—— ❊ ——

References

S. Nos.	Name of Book	Name of Author	Name of Publisher	Year of Pub.	Edition	Place of Pub.
1	Haider Ali and Tipu Sultan	Lewin B. Bowring	Idarah-i-Adabiyat Delhi	1893 1974	1st, Edn. 2009, 2nd. ,,	Qasimjan Street, Delhi-6.
2	The Sword of Tipu Sultan	Bhagwan S. Gidwani	Allied Publishers Ltd.	1976	1st. ,, 4,	Najafgarh Rd. New Delhi-15.
3	British Rule in India	W.M. James	Discovery Publishing House.	1882 1984	1st. ,, 2nd. ,,	8/81, Geeta Colony, Delhi-31.
4	The Moghul Emperors of Hindustan	Stanley Lane-Poole	Oriental Publishers			1488, Pataudi House, Daryaganj Delhi-110 006.
5	The Wahabi Movement in	Qeyamuddin Ahmad	Firmak K. L. Mukhopadhyay	1966	1st. ,,	Ghosh Printing House Pvt. Ltd. 17-A, British Indian Street. Calcutta-700 001

6	An Advanced History of India	R.C. Majumdar H.C. Raychandhari Kalikinkar Datta	Macmillan India Ltd.	1978	4th Edn.	Madras.
7	Modern Indian History.	V.D. Mahajan	S. Chand & Company	1988		New Delhi
8	Modern Indian History.	B.L. Grover	S. Chand & Company	1990	10th. Edn.	New Delhi.
9	...اور تلوار ٹوٹ گئی	نسیم حجازی	مکتبۂ عالمگیر جامع مسجد دہلی ۶	ـــــــ ۱۹۵۸ء	اول دوم	جامع مسجد دہلی-۶
10	تاریخ سلطنت خداداد (میسور)	محمود خاں محمود بنگلوری	اقبال بکڈپو نمبر ۱۰۴، اولڈ پور ہوز روڈ، بنگلور	ـــــــ ۱۹۳۹ء	اول دوم	برقی کوزبریس، معسکر بنگلور۔

OUR BOOKS IN ENGLISH

	Price
The Qura'n & Its Wisdom By Hammudah Abdalati	0.50
The Qura'n Basic Teachings (p.280 P.B.) By Thomas Ballantine Irving Khurshid Ahmed, Mohd. Manazir Ahsan	20.00
The Qura'n And Modern Science By Dr. Maurice Bucaille	3.00
Meaning and Significance of Dawah by Dr. Reyazul Hasan Jeelani	10.00
Islamic Revival and 15th Century Hijrah By Dr. Ahmed Sajjad	2.00
Is The Bible God's Word By Ahmad Deedat	5.00
Islam An Introduction By Sayyid Hamid Ali	6.00
Education in Early Islamic Period By Zafar Alam	20.00
Mawlana Mawdudi: An Introduction to His Life and Thought by Khurshid Ahmed and Zafar Ishaque Ansari	9.00
Islam My Fascination By Abdullah Adiyar Tr. by S.M. Iqbal	10.00

Catalogue may be had free of cost from

Markazi Maktaba Islami
1353, Chitli Qabr, Delhi-6